سلسلہ مطبوعات عصمت نمبر

طوفانِ حیات

تصنیف

مصورِ غم حضرت علامہ راشد الخیری رحمۃ اللہ علیہ

جسے

رازق الخیری ایڈیٹر عصمت و بنات نے

عصمت بک ڈپو دہلی سے شائع کیا

۱۹۴۳

نویں مرتبہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلا باب

(استغفر اللہ ربی) مشترکہ نہ تو اصلی نام تھا نہ ہو سکتا تھا نہ خدا کرے کسی مسلمان کا ہو، مگر انعام محمد خاں، خسر کے خیالات، ساس کے توہمات، بیوی کی روئداد اور بچی کی افتاد سے اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ ناصرہ خود ہی نہیں اپنے ساتھ اس مشترکہ کی بدولت ما اور باپ دونوں کو برباد کر کے چھوڑے گی۔ اکلوتی بچی تھی وہ بھی پہلونٹی کی نہیں، پانچ میں ایک ماباپ ہی پر کیا منحصر ہے۔ کنبہ بھر فریفتہ تھا۔ مگر انعام ان باپوں میں باپ نہ تھا کہ اولاد کی پرورش میں جا و بیجا کا امتیاز اور بھلائی، برائی کا تفرقہ باقی نہ رہے۔ حقیقتاً وہ ماں سے زیادہ بیٹی کا دلدادہ تھا مگر خوب سمجھتا تھا کہ ہاجرہ (بیوی) ناصرہ (بیٹی) کے دل میں وہ بیج بو رہی ہے جس کا گھن آس پاس ہی نہیں دور دور پھیلے گا، پوت کے پاؤں پالنے میں معلوم ہو جاتے ہیں، شبہ یا اندیشہ نہیں۔ یقین اور یقین بھی یقین کامل تھا کہ یہ ضعیف الاعتقادی بربادی کا پیش خیمہ اور رسوم کا انبار مصیبت کا پہاڑ ہے۔ چلّے اور رجابے خالی جانے والے اور شرک و رسم پرستی، ایسی چھوٹنے والی نہیں۔ حقیقت کا حال تو خدا جانے کہ واقعیت تھی یا تقاضائے ضرورت مگر بظاہر تو اسی یقین کا نتیجہ اور احتیاط کا انجام تھا کہ سخت غصہ ہو یا فرطِ شفقت، اس نے یک لخت ناصرہ چھوڑ مشترکہ کہنا شروع کر دیا۔ چچا نہیں، تایا نہیں، جان پہچان نہیں، آیا اگایا نہیں حقیقی باپ اور جائز وارث، دو چار دفعہ منہ سے نکالنا تھا کہ چھوٹے بڑے سب کے منہ میں بھی پڑ گیا اور ایک پانچ چھ ہی برس کے الٹ پھیر میں اتنا مشہور ہوا کہ کوئی بھولے

سے بھی ناصرہ نہ کہتا۔ مکتب میں مدرسہ میں، محلہ میں پڑوس میں۔ کنبہ میں۔ خاندان میں۔ لفافوں میں، مختار ناموں میں۔ سرخط میں۔ قبالہ میں حتیٰ کہ مہر نامہ میں بھی یہی لکھا گیا۔

ہم کو انعام محمد خاں جیسے سیدھے سادھے مسلمان سے بدگمان ہونے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ کیا جو کر سکتا تھا اور کرتا وہ تھا جو ممکن تھا، بیٹی کا نام اس نے بدلا گھر کے کام اس نے بدلے۔ موقع دیکھ کر خفا ہوا، رُخ پا کر خوشامد کی۔ بھلائی کی باتیں۔ بُرائی کے دن جتائے، شرک کا انجام، رسوم کا نتیجہ اپنی طرف سے سمجھانے میں اور بجھانے میں اس نے کسر نہ چھوڑی لیکن بیوی کے رنگ آسانی سے چھوٹنے والے نہ تھے، رسمیں اس کی گھٹی میں، شرک اس کی طبیعت میں ادھی میں رہی، ان ہی میں سہی، میکے کی زندگی کا کوئی حصہ دو یا چار سال نہیں۔ سارا کوارپنہ اسی حال میں گذرا، سُسرال میں پہنچی تو سرتاپا رسوم کی پوٹ تھی، خوش قسمتی سے میدان صاف تھا، ساس سُسرے تو درکنار کوئی چھوٹوں بڑوں میں بھی تاکرنے والا نہ تھا۔ سو روپے ماہوار کی آمدنی اور دو میاں بیوی، سرآتے پاؤں جاتے، دس بیس برس کا گھر نہیں، ساٹھ ستر برس کا بنا بنایا جکڑا بندھا، پانچ پشتوں کا گھر، برسوں کی جمع پونجی، مدتوں کی کھرچن، سلیقہ والے لوگ، دروازہ پر گھوڑا، ڈیوڑھی پر پالکی، گھر میں ایک چھوڑ دو دو ماما ئیں، رہنے کی عالیشان حویلی، حویلی کیا محل سرا، دوکانیں، مکان، جائداد اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ کچھ نہیں تو کم سے کم پچیس ہزار کا سرمایہ تو ہوگا جس کی مالک ایک اکیلی ہاجرہ شادی کے بعد تھی۔ شروع شروع میں انعام کو خاک پتہ نہ چل سکا کہ بیوی کے پیٹ میں کیا گُن بھرے پڑے ہیں۔ باوجود انگریزی کی معقول تعلیم کے وہ خاصا نمازی تھا، بیوی کو دیکھا تو وہ ایسی نمازن کہ فجر اور عشا تو درکنار، تہجد اور اشراق تک ناغہ نہ ہو۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں تعلیم نسواں کے چرچے اور طرز جدید کے ہاتھوں جو مٹی مسلمانوں کی پلید ہوئی۔ اس کو سُن سُن کر کانوں پر ہاتھ دھرتا تھا۔ خدا خدا کر کے شادی ہوئی تو سہم رہا تھا کہ دیکھئے یہ نکاح خانہ آبادی ہے یا گھر کی بربادی۔ اب جو بیوی کو مذہب

کا پابند دیکھا تو خوشی کے مارے اُچھل پڑا۔

دوسرا باب

خیر کیوں خاصے ڈھائی، پونے تین سال آنکھ بند کر کے گزر گئے۔ اس وقت تک انعام نمک کے محکمہ میں سو روپیہ کا داروغہ تھا۔ باپ دادا کی آنکھیں دیکھے ہوئے اور رئیسی ماں کی گود میں پلا ہوا جو مرتے مرتے پچیس ہزار کی جائداد چھوڑ گئی۔ اول روز سے یہی وطیرہ اختیار کر لیا کہ اِدھر تنخواہ ملی اور اُدھر اس نے کوڑی کوڑی اور دام دام بیوی کے نام روانہ کر دی۔ اس کا خیال تھا کہ پچیس تیس نہیں ایک دم پر چالیس پچاس صرف ہو جاتے ہوں گے۔ کچھ نہیں تو پچاس روپیہ مہینہ الگ کا الگ جمع ہوتا ہوگا۔ اب جو سال بھر کی چھٹی لے کر گھر آیا تو معلوم ہوا کہ بیوی آنکھوں کی اندھی، رسموں کی بندی، جہالت کی ڈھیری اور فقیروں کی پیری ہے۔ بچہ کے ارمان میں انعام اور ہاجرہ برابر کے شریک تھے تین سال کا زمانہ دونوں ہی نے گن گن کر کاٹا، فرق اتنا تھا میاں نے اس تاخیر کو اتفاق پر محمول کیا، بیوی نے اِدھر اُدھر کی کوششیں شروع کر دیں، تعویذ، گنڈے، ٹونے، ٹوٹکے صبح سے شام اسی چکر میں ہوتی، دَم کیا ہوا پانی آتا۔ سوت لپیٹے ہوئے فلیتے آتے۔ ولادت کی نماز ہوتی، بی بی کی نیاز ہوتی۔ غرض رات دن کا یہی تانتا تھا۔ آنے کو تو اس عرصہ میں انعام پانچ چھ مرتبہ آیا۔ مگر دو چار دن کو آیا چلا گیا۔ لگ کر پانچ چار مہینے کبھی نہ ٹھہرا، ہاں شادی کے بعد پندرہ روز رہا تو اِدھر تو ہاجرہ نئی نئی دلہن اُدھر خود انعام نے زیادہ توجہ نہ کی۔ بات نہ کھلی، اب جو یہ سوانگ دیکھتا تو مارے ہنسی کے پیٹ میں بل پڑ جاتے۔

انعام کے مذہبی عقائد ایک خاص قسم کے تھے وہ بھی اپنی دانست میں پکا مسلمان اور سچا موحد تھا، کچھ یہ نہیں کہ انگریزی تعلیم نے اس کو ایسا بنا دیا، بلکہ اس نے آنکھ کھول کر صورت ہی ایسے لوگوں کی دیکھی جو محرم کی نیاز و عرس کی شرکت دونوں کو بدعت سمجھیں اس کے حقیقی دادا مولانا عبد الہادی مشہور عالم تھے جن کی جامع مسجد آج نصف صدی

کے بعد بھی ان کا نام روشن کر رہی ہے۔ دیکھنے میں بالکل سیدھے مگر عقیدے کے ایسے پختہ کہ چار برس کا بچہ بھی تعزیوں میں چلا جائے تو آفت برپا کر دیں، آدھے سے زیادہ شہر اُن کا مرید تھا، شہرت سُن کر دُور دُور سے لوگ زیارت کو آتے، ناکام آتے۔ شادکام جاتے۔ مولوی صاحب نہ مشہور ولی اللہ تھے، نہ مدعی عارف باللہ، ہاں ان کی زندگی نمونہ تھا اسلام کی صداقت کا اور گھر مخزن خدا کی رحمت کا، مرد اور عورت، بیوی اور بچے بھلے اور نیک، سچے اور اچھے، تکلیف ہو یا آرام، دکھ میں صبر، سکھ میں شکر، ہر حال میں راضی ہر بات میں خوش، موت پر یقین، خدا پر بھروسہ، مذہب کی وقعت، اسلام کی محبت، ہر قول سے ہر فعل سے، ہر بڑے سے اور ہر چھوٹے سے ٹپک رہی تھی عقیدتمندی کی انتہا، اور یقین کامل کی حد آخر یہ تھی کہ تکلیف کا علاج بیماری کا حکیم طبیب نہ ڈاکٹر صرف ایک رب الموجودات یعنی صدقہ اور خیرات، جب کوئی خوشی میسر ہوتی تو تمام خاندان اس جوش و خروش سے اپنے مالک کا شکریہ ادا کرتا کہ مکان کا چپہ چپہ خالق حقیقی کی عظمت کا پتہ دیتا۔ جس وقت نعرۂ توحید ہوا میں گونجتا تو سُننے والے تھرا اُٹھتے اور رستہ چلتے زار و قطار رونے لگتے۔ عید کی صبح کو جب مؤذن حاکم اصلی کے جبروت کے ساتھ روز عید کی آمد کا مژدہ مسلمانوں کے کان تک پہنچاتا تو مولوی صاحب بیوی بچوں، بیٹے بیٹیوں کو لے کر صحن میں کھڑے ہوتے اور سب گڑگڑا گڑگڑا کر کہتے:-

"زمین و آسمان کے سچے مالک، جنگل اور بیابان کے حقیقی بادشاہ! شب سیاہ و شب ماہ میں برابر دیکھنے والے آقا! تو وہ جس کی قدرت کا راگ فلک نیلو فری نے تاروں کو گود میں لئے رات بھر گایا، تو وہ جس کی عظمت کا نشان بساطِ زمین کی کائنات کے دن بھر دیا۔ اس نازک وقت میں جبکہ دنیائے حیات میں تیری ارفع و اعلیٰ شان مختلف صورتوں میں ظاہر ہو رہی ہے، ہم چند گنہگار لونڈیاں، نکھٹوڑے سے ذلیل غلام سب سے پہلے تیرے سلام کو نہیں، نہیں مولا تیرے دربار میں تجھے سجدہ کرنے

حاضر ہوئے ہیں، یہ سفید ڈاڑھیاں، سیاہ چوٹیاں، معصوم پیشانیاں تیرے سامنے جھکی ہوئی ہیں۔ مولا ہو تیری بزرگی کا جھنڈا روئے زمین پر اڑا رہی ہے اور واقعات کا اختلاف تیرے غضب و رحم کا ثبوت دے رہا ہے۔ عید کا روز ہے۔ برس کا برس دن، رونے والی آنکھوں ہیں ہنسنے والے دلوں میں تیرا جمال جھلک رہا ہے، جامع المتفرقین مدتوں کے بچھڑے جن کی راتیں تڑپ تڑپ کر بیتیں جن کے دن پھڑک پھڑک کر ختم ہوئے آج تو نے ملا دئے۔ ارحم الرحمین تو نے اپنی قدرت سے اپنی رحمت سے موسیٰ ؑ کی طرح اس بچہ کو بھی ماکے کلیجے سے چھٹوادیا جو دروازے کو تک رہی تھی، مُردے میں جان ڈالنے والے حکیم! اس مریض کو صحت دے کر جسے طبیب جواب دے چکے تھے۔ بیسیوں دل باغ باغ کر دیئے۔ اس غلام اور فقیر کو جو دو دو دانوں کو محتاج۔ اس رانڈ دکھیاری کو جو حسرت سے ایک ایک کا منہ تکتی تھی۔ تو نے اے مالک الملک! دولت دے کر، ثروت دے کر، عزت دے کر۔ سلطنت دے کر اپنی خدائی کا سکہ بٹھا دیا، یتیموں کے مولا، مظلوموں کے مددگار بحرِ ذخار کی تنہا اور ڈراونی رات میں جب لہریں آسمان سے باتیں کرتی تھیں اور جہاز بھنور میں پھنسا تھا، تارے بدنصیب مسافروں کی حالت زار پر کھلکھلا کھلکھلا کر غائب ہوتے تھے۔ موت سر پر کھیل رہی تھی۔ کڑکتے ہوئے بادل اور چمکتی ہوئی بجلی کلیجے دہلا رہی تھی، تو نے اپنی رحمتِ کاملہ سے ان کا بیڑا پار کیا اور حسرت نصیب مسافروں کو کنارہ پر پہنچا دیا:۔

منتقمِ حقیقی! وہ خوش حال بیوی جس کو تو نے ہر قسم کی دولت سے مالا مال کیا جس کو زندگی نعمت اور دنیا جنت تھی جو بیٹے کی شادی پر ہزاروں روپیہ صرف کر رہی تھی اس لئے کہ مظلوم پڑ ہنسی اور یتیم کا دل دکھایا۔ تیرے ایک طیش میں اپنے عیش سے اور جوان شیر سے ہمیشہ کو بچھڑ گئی۔ ادنیٰ سی نافرمانی پر راجوں کے راج چھیننے والے حاکم تیرا فیصلہ

بدلہ لینے والا

سچّا، ذرہ بھر نخوت پر شاہوں کے تاج چھین لینے والے بادشاہ! تیرا انتظام اچھا، تیرا دربار عظیم، تیری سرکار بڑی - ربّ ذو المنن ہم چند تن دست بستہ حاضر ہیں - ہماری التجاؤں میں تاثیر، ہماری دعاؤں میں اثر دے!

تو نے اپنی رحمت و عنایت سے آج ہم کو اس قابل کیا کہ ہم اس یوم سعید یعنی عید کی خوشیاں منائیں طبیعتوں میں اطمینان دے کہ تیری اطاعت سے منحرف نہ ہوں، اپنے رحم سے، اپنے کرم سے، ہماری شان بڑھائی، ہماری آن بان قائم رکھی حیثیت سے بڑھ کر دولت دی، ضرورت سے زیادہ عزت دی معبودِ حقیقی اپنی محبت دے کہ تیری فرمانبرداری میں سرگرم رہیں - رہنے کو مکان دیا تن ڈھانکنے کو لباس دیا، صبح و شام رزق دیا، الٰہ العالمین! نورِ اسلام دے کہ دنیا کے ساتھ آخرت بھی میسّر ہو - اعضا میں طاقت دی آنکھوں میں بصارت دی - شوہر دیا، بچے دیئے، بیوی دی - دنیا کی بہار دی حکیم علی الاطلاق اپنی الفت میں سرشار رکھ - آتشِ دوزخ گلزار ہو جائے - شہنشاہِ دو جہاں ہماری جیسی بہت سی مخلوق ہماری طرح کے بہت سے انسان ہم سے بہتر مسلمان اس عید کے مستحق ہیں - عزیز الحکیم! رانڈیں ہیں، یتیم ہیں، الٰہ العالمین ناتواں ہیں، مریض ہیں حی القیوم! معصوم ہیں، مظلوم ہیں، ربّ الارض والسماء اپنے فضل و عطا سے صاحب جاہ و حشم اپنے رحم و کرم سے، برکت و عزت والے اپنی شفقت و وعنایت سے ارحم الراحمین رحم، کریم رحم، رحم، وحدہٗ لاشریک لہٗ رحم مولا، بے اولادوں کو اولاد، نامرادوں کو مراد، مریضوں کو صحت، ناتوانوں کو طاقت، بیکار کو کمائی - مقروض کو رہائی، بیٹیوں کو بر، پردیسیوں کو گھر، بیکسوں پر رحمت، کاروبار میں برکت، اچھے برے، دوست دشمن عزیز غیر الٰہ العالمین سب کی خیر!

تیسرا باب

اس صحبت کا انسان ایسے خاندان کا بچہ جس کی عمر ان چرچوں میں گذری جو کچھ

بھی ہو تھوڑا تھا۔ ہم تو اس دعا میں سب سے بڑا راز یہ دیکھتے ہیں کہ از ابتدا تا انتہا اور کسی کا واسطہ تو درکنار رسالت کے طفیل سے بھی تو احتراز ہے۔ یہ ہی تھا وہ یقین و عقیدہ جس پر مولانا المدہران کے خاندان کو ہمیشہ ناز رہا۔ قیود ملازمت نے انعام کی نماز کو گنڈہ دار ضرور کر دیا۔ مگر خیالات میں فرق نہ آسکتا تھا نہ آیا کسی کی محنت برباد نہیں جاتی۔ اب یہ خدا جانے کہ میاں کی دعا کا اثر تھا یا بیوی کی کوششوں کا نتیجہ۔ مراد پوری ہوئی، اولاد کا وقت آپہنچا، آثار حمل کے نمودار ہوتے ہی دونوں وقت مسجدوں میں گھی کے چراغ جلنے لگے۔ ایک مہینہ اسی طرح جوں توں کٹا۔ دوسرے مہینے کا شروع ہونا تھا کہ گلے میں ہنسلی رہی نہ پاؤں میں کڑا، سارے بدن پر تعویذوں کی حمائل پڑی تھی۔ جدھر دیکھو نقش اور جس طرف نظر ڈالو تعویذ۔ اس پر ستم پڑھا ہوا کاجل تھا۔ دن میں تین تین مرتبہ لگتا اور چار چار دفعہ چھپتا، عورت کیا پاگل معلوم ہوتی تھی، آنکھوں میں ڈھیر سا کاجل، ماتھے پر نظر کا ٹیکہ، سرخ قمیض، سیاہ تعویذ، کردٹ میں خریطے، سامنے فلیتے چاروں خانے چت پلنگ پر پڑی ہے۔ روزہ گیا، نماز گئی، پھرنا چلنا گیا۔ آنا جانا، ملنا ملانا، سب چھوٹا، دوست رہ گئے تو پیر اور عزیز رہ گئے تو فقیر، چاہیے تو یہ تھا اور انعام سے توقع بھی یہی تھی کہ بچہ کی پیدائش کی اس کو جس قدر خوشی تھی تعویذوں کی آرائش قطعاً زائل کر دیتی مگر رونا اسی کا ہے کہ توقع سے زیادہ امید اور امید سے زیادہ توقع دونوں ناکام رہیں۔ اس پر ان معاملات کا اثر ضرور ہوا۔ مگر مرد تھا، روپے کا درد ہونا۔ بیسیوں روپے اور سیروں مٹھائی۔ جو دن رات اٹھنے کھا رہے تھے ان پر توجہ کرتا تو سیدھی انگلیوں گھی نہ نکلتا ٹیڑھی کرتا۔ مگر دس پانچ دفعہ کہہ سن، ٹک جھک اس کو دخل دینا ہی قسم ہو گیا اور چھ مہینے ہوا کی طرح نکل گئے۔

ساتویں مہینے کا آغاز ہوتے ہی جس کی تہ میں گود بھرنے کا راز پوشیدہ تھا چاروں طرف سے گود بھرائی کی صدائیں شروع ہوئیں معمولی بات ہوتی تو شاید اب بھی انعام

کے کان تک نہ پہنچی مگر مہینہ کا آخر تھا جمعہ جگر اشاہ صاحب کی نذر ہو چکی تھی تاریخ ٹالنا ممکن نہ تھا۔ سب سے پہلے تو ساس نے کہا:۔

"میاں! ایسی بے غیرتی بھی کس کام کی! نگوڑے ٹکے کے فقیر بھی ستوانسے اور نوماسے کی گود بھر دیتے ہیں۔ پان نہیں پتہ، پھول نہیں پنکھڑی، بہت نہیں تھوڑی، نوج کسی سہاگن کا ستوانسا خالی جائے، یہ توڑوں کی مقرر کی ہوئی باتیں ہیں، کہ بچہ ہرا بھرا آئے، زچہ ہنستی کھیلتی اُٹھے۔ تمھاری اماں زندہ ہوتیں تو سمجھتیں ان کی پہلوٹھی کی گود تو اس دھوم دھام سے بھری گئی تھی کہ سارے شہر میں نام ہو گیا تھا، شرک نہیں، بدعت نہیں، یہ دنیا کی رسمیں اور بہوت کی جوت ہے دو دن اور رہ گئے، پرسوں جمعہ کو ساتواں بھر کر اللہ رکھے آٹھواں گنا شروع ہو جائیگا، بچورے کا پورا مہینہ خالی نکل گیا، کون سی ایسی موئی فقیرنی ہو گی جس کو مہینہ بھر آدھ پا کا ہتیہ بھی نہ جڑے، ساتواں اور نواں دونوں مہینے اصل خیر سے نیازوں ہی کے ہیں۔ بڑے بڑیلوں کی، اوت پنوتوں کی، پیر فقیروں کی، ابھی تک ایک کی نہیں ہوئی، میری بچی کی جان سے دور، ننھی سلطان کیا تم کو یاد نہ ہو گی۔ کیسی پچ مچاتی لاش گئی ہے۔ اچھی خاصی، بھلی چنگی سرخ کپڑے پہنے، زیوروں لدی، پھول بھرے، پورے دن میٹھی پان بنا رہی تھی، ایک گود نہ بھرنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ لڑکی ہنستی بولتی چٹ پٹ ہو گئی۔ ایسا کسی نے کلیجہ توڑا کہ موں بھی نہ کر سکی۔ میرے منہ میں خاک، خدانخواستہ ایسی ویسی ہو گئی تو تم کو بیویوں کی کیا کمی۔ مگر مجھے بیٹی کہاں نصیب، میں تو اپنے پاس سے ایک کیا بیس نیازیں دلوا دیتی۔ مگر دل میں وہم آتا ہے۔ سہاگن کی گود میں بھرنے والی کون اور کچھ نہیں ہو سکتا ہاتھ تنگ ہے تو زیادہ نہ کرو ساتوں ہری ترکاریاں لاؤ تھوڑا سا میوہ لے لو کھانا دونوں وقت پکتا ہی ہے ایک آدمی کا نکل آئے گی لیکن میاں یہ رسم جس طرح ہو آج پوری کر دو۔"

اپنی ماں اور بیوی کی ماں میں فرق نہیں ہوتا اور پھر اس شخص کی نگاہ میں جس کی طبیعت کا جزو اعظم بزرگوں کا ادب ہو، ساس کی گفتگو ختم ہوئی تو میاں کی خاموش آنکھیں بیوی کی طرف اس توقع پر پڑیں کہ شاید بیوی کی زبان سے ایمان کی بات نکلے اور یہ ماجرہ کے ہاتھ اس زخم پر مرہم رکھیں لیکن آنسوؤں کی زارقطار لڑیوں نے ایک اور چرکا دیا۔ خاموش اٹھا گم سُم چلا اور چپ چاپ آکر اپنے کمرے میں بیٹھ گیا۔ سوچتا تھا کہ آخر ان بیہودگیوں کا انجام کیا ہوگا۔ بدنام ہوں گا ہنسی اڑے گی مضحکہ ہوگا جو دیکھے گا وہ ہنسے گا، جو سنے گا وہ ٹھٹے اڑائے گا۔ غیر خوش ہوں گے۔ عزیز روئیں گے۔ بیوی اور بیوی کے ساتھ سسرال نہال ہوگی کہ خوب داماد ہاتھ لگا۔ مگر اماں باوا کی روح لعنت بھیجے گی کہ اچھا بچہ چھوڑا، کیا کروں کیا نہ کروں۔ طبیعت میں اضطراب، دل میں بے چینی، مُردوں کا ملال، زندوں کا خیال، دونو آنکھ کے روبرو، نہ رہا گیا اور بیوی کے آنسوؤں نے ماباپ کی لعنت کو دھو دیا، اُٹھا، چلمن کھولی تو ساس کیا ایسی بھولی بخشیں، ڈولی منگوا کبھی کی چمپت ہو چکیں، پوچھا "کیا اماں جان چلی گئیں؟" مگر اتنے بڑے گنہگار کہ بیوی کی سرکار سے عتاب کا اندیشہ تھا نہ کہ جواب کی توقع۔ اِدھر ٹہلا اُدھر ٹہلا قریب آکر پوچھا، سر کھجا کر پوچھا، آواز دی، پاؤں ہلایا جھنجوڑا اور کہا "سو گئیں؟" بیوی کسمسا کر اٹھیں تو میکے کی ماما نے کہا "سوئیں گی کیا خاک کہیں درد میں نیند تھوڑی آتی ہے صبح سے سمجھا رہی تھی کہ یہ دن ایسے ہی ہوتے ہیں اپنا دل میلا نہ کرو، اتنی دیر جو روئیں، جی برا کیا، درد اُٹھ آیا۔ کچے درد خدا دشمن کو بھی نہ دے۔ بڑی بیوی نے جا کر اب گنڈا بھیجا ہے تو ذرا ہلکے ہوئے ہیں، نہیں تو گھنٹہ بھر مچھلی کی تڑپی ہیں، میاں تم کیا دیر لگا رہے ہو زیادہ نہیں، کم ہی کر دو پیسہ پیسہ کی ترکاری لے لو، بلا سے شگون تو ہو جائے پاس نہیں ہے تو اب چوری تھوڑی کر دگے!"

ماما کی گفتگو نے انعام کے زخم پر ایسی اچھی طرح نون مرچ چھڑکا کہ کراہنے کی بھی اجازت نہ تھی، دانت چبا رہا تھا کہ بیوی نے کہا "اچھی خالہ نصرت! تم بھی کیا بے غیرت ہو، کیوں کہے جاتی ہو آفت آئے گی تو مجھ پر، جان جائے گی تو میری، مصیبت بھگتوں گی تو میں، تم کو کیا؟"

انعام :- "اگر تم اس رسم کا پورا ہونا ضروری سمجھتی ہو تو بسم اللہ کرو۔ سودا بتادو میں ابھی منگوا دیتا ہوں۔"

بیوی :- "بس جانے دو کیا ضرورت ہے۔ روپیہ بچے گا اور کسی کام آجائے گا۔"

انعام :- "روپیہ اگر بچے گا تو تمہارے ہی کام آئے گا، برباد ہو گا تو تمہارا ہو گا۔ جب تم ایک خرچ کو اس قدر ضروری سمجھتی ہو تو میں کیوں روکوں، تم بتاؤ میں منگوا دوں۔"

بیوی :- "میرے کیا کام آئے گا۔ کام آئے گا اس کے جو بیٹھی ہو گی میں کہاں اور تمہاری کمائی کہاں"

انعام کمبخت جس قدر عقیدے کا پکا تھا اتنا ہی دل کا بودا۔ بیوی کی آخری بات سنتے ہی جی بھر آیا اور ایسا معلوم ہوا کہ آج ہی بیوی سے مفارقت ابدی ہو رہی ہے، آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ بھرائی ہوئی آواز سے کہا "لو چلو جانے دو، تم لکھواؤ میں ابھی منگوا دوں۔"

بمشکل تمام ہزاروں منتوں خوشامدوں سے بیوی رضا مند ہوئیں۔ سامان لکھوایا گیا۔ دو جوڑے بیر جی کے، ڈیڑھ من سامان کھیر کا پانچ من ترکاری وغیرہ وغیرہ۔

کیا مرنے کی بیر تھی، میاں اتنے بڑے سیدھے کہ ہاتھ نہ مٹھی ہڑبڑا اٹھی، گرہ میں نہیں کوڑی گئے ڈوائے ہوت، اچکن پہن لکڑی لے آدمی کو آواز دے چلنے لگے اور بیوی اتنی زیادہ ہشیار کہ جان کر اور بوجھ کر، سمجھ کر اور پہچان کر کہ میاں کے پاس پھوٹی کوڑی تک نہیں، ٹس سے مس نہ ہوئی۔ ڈیوڑھی سے باہر نکل کر انعام کو خیال آیا کہ روپے لوں، الٹے پاؤں لوٹا اور بیوی سے کہا لاؤ روپے دے دو مگر بیوی کے پاس کیا رکھا تھا۔

میاں :- "لاؤ جلدی دو شام ہو رہی ہے۔"

بیوی :- "میرے پاس روپیہ ہوتا تو تم ہی منگوانے کو رہ گئے تھے جس کی ناک پر ٹکا رکھتی وہی لا دیتا۔"

میاں "۔ کیا کہہ رہی ہو، تنخواہ میں سے جو کچھ صرف ہو کر بچا ہو اس میں سے دیدو۔"

بیوی ۔ "تنخواہ تھی بھی تو ہزاروں! سو روپلی اور کال کا خرچ، بچتا کیوں نہیں!"

میاں ۔ "تو کیا تمہارے پاس کچھ نہیں بچا، سو روپے ماہوار خرچ کرتی رہیں"

بیوی "۔ کہہ تو رہی ہوں ایک پیسہ نہیں اُٹھا سب کا سب جوں نوں امانت رکھا ہے!

میاں "۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم دِن خنم ہو گیا، اتنا سارا سودا ہے۔ آخر بتاؤ تو سہی ایک دم پر سو روپے مہینہ خرچ کرتی تھیں بلا!

بیوی ۔ "میں فضول خرچ تھی تو اب آئندہ میرے پاس نہ بھیجنا۔ میرا بھی اللہ مالک ہے"۔ بیوی کا ٹکا سا جواب سُن کر میاں کو سناٹا آگیا، کان دبا باہر آبیٹھے۔ مگر یہ خیال زیادہ دیر تک قایم نہ رہا، گو دبھرائی کے ڈر نے پھر سہمانا شروع کیا اندر جاتا تھا۔ مگر ساتھ ہی خیال آیا کہ انتظام روپیہ کا کرتا ہے، بیوی کے پاس جا کر کیا ہوگا۔ گلی میں پہنچ کر سوچنے لگا کہ کیا کروں ابّا جان کی نصیحت تھی کہ قرض سے موت بہتر ہے اور وصیت تھی کہ بھیک مانگ لینا، مگر قرض نہ لینا، آج نصیحت اور وصیت دونوں کا خاتمہ ہوتا ہے۔ خالہ فاطمہ کے پاس جاؤں اور تو کوئی نظر نہیں آتا مگر ہاں مہربان سنگھ ابا جان کے زمانہ کا بزاز ہے۔ ہزاروں کا لین دین تھا۔ دو دو تین تین ہزار روپیہ لے کر اٹھا ہے، کیا سو پچاس کا اعتبار نہ کرے گا کپڑا تو اس سے لوں باقی آکر دیکھا جائے گا۔

بات معقول تھی اور خیال اچھا، انعام سیدھا مہربان سنگھ کی دکان پر پہنچا بہت سے گاہک بیٹھے تھے۔ کپڑا نکلوا کر دیکھا اور پرچہ کے موافق پھڑوالیا۔ دو پیلے لیے حساب کیا تو ایک سو چالیس روپے تیرہ آنے کا تھا۔

انعام "۔ لالہ مہربان سنگھ کہاں تشریف لے گئے ہیں؟"

بزاز "۔ ان کو تو مرے ہوئے بھی سترہ برس ہو گئے۔"

انعام "آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟"

بزاز "جی نہیں سینکڑوں صاحب تشریف لاتے ہیں، کچھ خیال نہیں آپ کا دولت خانہ یہیں ہے؟"

انعام "میں مولوی عبدالہادی صاحب کا پوتا ہوں، ہزاروں کا لین دین بڑے لالہ سے تھا، میں نمک کے محکمہ میں انسپکٹر ہوں تنخواہ دوسری کو آتی ہے۔ کپڑے کی ضرورت تھی۔ میں نے کہا جا کر لے آؤں، روپیہ بھیج دیا جائے گا۔"

بزاز "صاحب میں نے تو قرض کا کھاتا ہی بند کر دیا ہے۔ بڑے لالہ کا دیوالہ تو اسی میں نکلا۔ کیا بتاؤں مجھے تو عذر نہ تھا۔ مگر ساجھی موجود نہیں ہے۔"

انعام "مگر مجھے تو صرف تین چار روز کے واسطے ضرورت ہے۔ دوسری کو روپیہ آ جائے گا آپ مطمئن رہیں۔"

بزاز "میں عرض کر چکا نا! مجھے معاف فرمائیے، یہ دونوں رکھ دیجئے کپڑا جو پھٹ گیا ہے اس کے دام دے دیجئے اور رے جائیے۔"

انعام "روپیہ تو اس وقت میں کچھ بھی ساتھ نہیں لایا۔ آپ دو روز کا اعتبار کیجئے میں اپنے ہاتھ کی تحریر دیتا ہوں۔"

بزاز "بندہ نواز ساڑھے نو ہزار کی تحریریں پڑی جھک مار رہی ہیں، آپ کے پاس روپیہ نہ تھا تو آپ نے کپڑا کیوں اترو دیا؟"

بزاز نے یہ فقرہ ذرا گرم ہو کر کہا، تو جتنے گاہک تھے سب اپنا سودا چھوڑ چھاڑ انعام کو گھورنے لگے دو لمحہ سکوت رہا اس کے بعد بزاز نے کہا" یہ کپڑا میرے کام کا نہیں روپیہ رکھ دیجئے، ایسے آسامی باز بہت سے دیکھے ہیں۔"

انعام عجیب مصیبت میں تھے کہ کبھی بزاز کی صورت دیکھتے کبھی گاہکوں کی، اُٹھ سکتے تھے نہ بول سکتے تھے۔ آخر ایک شخص نے کہا "جناب آپ دیکھنے میں تو مرد معقول ہیں اور باتیں بھی صاف ہیں مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنجناب کا دماغ ٹھیک نہیں۔"

انعام "آپ نے میری کونسی حرکت مجنونہ دیکھی، آپ نہایت بد تہذیب انسان معلوم ہوتے ہیں۔"

گاہک "غریب پرور دیوانوں کے سر پر کیا سینگ ہوتے ہیں، کوڑی آپ کے پاس نہیں، مانگے تانگے کے کپڑے پہن دکان پر آبیٹھے اور ڈیڑھ سو روپے کا کپڑا اتروالیا۔"

انعام "منہ سنبھال کر بولیئے اور اتنا خیال رکھیئے کہ آپ کی گفتگو سے کسی بھلے مانس کی توہین ہو رہی ہے۔"

گاہک "بھلمنساہٹ تو آپ کے چہرہ پر لکھی ہوئی ہے اور خود آپ کا چہرہ شرافت کی شہادت دے رہا ہے، آپ نواب رحمت علی خاں کے صاحبزادے ہیں دادا صاحب کا کیا نام فرمایا تھا، نواب نعمت علی خاں!" نعمت کے نام پر تو دکاندار اور گاہک سب نے قہقہہ لگایا، اور میاں انعام کا تو یہ عالم ہوا کہ زمین میں گڑ گئے، گردن نیچی پسینے پسینے ہوئے بیٹھے ہیں۔"

دوسرا گاہک "شریف صاحب روپیہ عنایت فرمایئے یا میں رکابیں جلوں، محل سرا سے عنایت فرمایئے گا؟"

تیسرا "جناب آپ کیوں کسی مرد معقول کی توہین کرتے ہیں محل سرا سے ان سے کیا واسطہ کیوں صاحب آپ تو شاید لال قلعہ کے بالاخانہ کی کسی ممٹی کے موکھوں میں قیام پذیر ہیں۔"

انعام بدنصیب صورت سیرت وضع قطع لباس گفتگو ہر اعتبار سے معقول انسان معلوم ہوتا تھا بزاز نے کپڑا اپنے آگے رکھا اور کہا "جایئے قبلہ تشریف لیجایئے۔" اٹھا تو ندامت کی یہ کیفیت تھی کہ قدم اٹھانا کہیں تھا پڑتا کہیں، جی میں کہتا کہ زمین شق ہو جائے اور سما جاؤں۔ جھٹ پٹا غنیمت ہو گیا۔ اور جلدی جلدی قدم اٹھا آنکھوں سے اوجھل ہوا، تو سوچنے لگا میں صرف اس غلطی کا مرتکب ہوں کہ روپیہ پاس نہ تھا، اور کپڑا لے لیا۔ لیکن مجھے یقین کامل تھا کہ ڈیڑھ سو کیا ڈیڑھ ہزار کا کپڑا ہوتا تو اس دکان سے لے جاتا مجھے کیا مہربان سنگر یاد نہیں پچیس روپے دادا جان سے قرض لے کر دکان شروع کی تھی، نیت کا

اچھا تھا، خدا نے برکت دی، جب تک زندہ رہا ہم سب کے پاؤں دھو دھو کر پیئے یہ شام میرے سامنے کا بچہ ہے، میں نے پہچان لیا، یہ کیوں نہ پہچانتا مگر نمک حرام ہے، خیر مجھے اس سے کیا گلہ ہو سکتا ہے۔ افسوس مجھے اپنی حالت پر ہے کہ سو روپیہ کا ملازم ہوی کے سوا کوئی خرچ نہیں اور آج ایک روپیہ پاس نہ ہو، جس عورت نے ڈھائی تین برس میں ایک پیسہ نہ بچایا ہو آیندہ اُس سے کیا فلاح ہو سکتی ہے، مگر اب تو وعدہ کر کے آیا ہوں خالی ہاتھ جاؤں گا تو بالکل ہی بات گئی گذری ہو گی کوئی چیز بھی تو ایسی نہیں کہ اسے ہی چپکے سے بیچ یہ بھرنا بھر دوں، مگر ہاں گھڑی تو باہر مردانہ میں ہے اس کو علیحدہ کر دوں، اگلے ہی برس پونے دو سو کی لی تھی، ڈیڑھ سو کو ہنس کھیل کر بک جائیگی۔ یہ خیال آتے ہی وہ ندامت وافسردگی سب رفع ہو گئی اور رفتار میں بھی کسی قدر تیزی شروع ہو گئی۔ گھر پہنچا تو میر اسین لہک لہک کر زچہ گیریاں گا رہی تھیں، دروازہ کھول خاموشی سے گھڑی نکالی اور باہر آیا۔

چاندنی رات تھی، تارے سر پر تھے اور رسموں کے مارے انعام چاروں طرف اس فکر میں مارے مارے پھر رہے تھے کہ کوئی خریدار مل جائے تو گھڑی اونے پونے ٹال دوں، مگر رات کا وقت گھڑی ساز دوکانیں بند کر چکے، کسی کو خبر کیا کہ داروغہ صاحب اس فکر میں ٹہل رہے ہیں، پھرتے پھراتے ایک دوکاندار نظر آیا جو دکان بند کر رہا تھا۔ تھا تو بساطی مگر کھلتے گھڑیاں بھی رکھ چھوڑی تھیں، تین چار مرتبہ دل کڑا کیا آگے بڑھا پھر ہمت نہ پڑی آخر ایک بار الا اللہ کہہ کر جا ہی پہنچا اور گھڑی بڑھا کر کہہ بھی دیا: ذرا اس کو دیکھیے۔"

بساطی۔ "کیا صاف ہو گی؟"

انعام۔ "جی نہیں صاف کیا ہو گی چل رہی ہے۔ میں اس کو علیحدہ کرنا چاہتا ہوں۔"

بساطی۔ "آپ کو اس وقت اس کے بیچنے کی کیا ضرورت پیش آئی دن پڑا ہوا تھا۔ یہ رات کا معاملہ کیسا۔ کو توالی میں لکھوا دیجیے گا۔"

انعام:- "وہاں جانے کی تو چنداں ضرورت نہیں، میری چیز ہے میں بیچتا ہوں، آپ میرا نام اور پتہ لکھ لیجئے، میں نمک میں انسپکٹر ہوں۔"

بساطی:- "آپ کتنے تک دے سکتے ہیں؟"

انعام:- "آپ کی رائے میں اس کی کیا قیمت ہے؟"

بساطی:- "بات یہ ہے کہ میں تو پیسے کا بھی خریدار نہیں ہوں، ہاں کوئی لینے والا ہو تو دس روپیہ تک دے دیجئے۔"

انعام:- "لائیے دیدیجئے، مجھے بیچنا منظور نہیں۔"

بساطی:- "آپ کی رائے میں کتنے کا مال ہے؟"

انعام:- "پونے دو سو کی میری خرید ہے۔"

بساطی:- "آپ بھول گئے ہوں گے پونے دو ہزار سے کم نہ آئی ہوگی۔ لیجئے اور مہربانی فرما کر سیدھے چلے جائیے۔ سپاہی پھر رہے ہیں، کہیں لینے کے دینے پڑ جائیں۔"

اپنے اوپر لعنت بھیجتا اور بیوی پر نفریں کرتا ہوا آگے بڑھا۔ دس بج رہے تھے، مجبوراً گھر کی طرف لوٹا راستہ میں تھا کہ پھر وہی وسماں آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ اور خیال آیا کہ خدا جانے کتنے مہمان گھر میں آ بھرے ہوں گے، گود بھرائی ہے دل لگی نہیں۔ بیرانیں آئی ہیں تو سننے والے پہلے آئے ہوں گے۔ خالی ہاتھ جاتا ہوں تو آج پوری ناک کٹ جائے گی، لاؤ خالہ کے پاس اور ہو آؤں۔"

خالہ فاطمہ کا گھر کچھ نہیں تو ایک ڈیڑھ میل تو ہوگا۔ بیچاری کبھی کی پڑ کر ڈھیر ہو چکی تھیں کہ کنڈی کی آواز کان میں آئی، جاڑوں کا موسم اندر کے دالان میں سب دبکے سکڑے لحافوں میں منہ دیئے لیٹے تھے۔ بڑی مشکل سے آواز پہنچی تو گھبرا گئیں، مزہ یہ تھا کہ گھر میں کوئی مرد نہیں، آپ تھیں یا ایک کنواری بیٹی، اور دو چھوٹے بچے، آدھی رات کا وقت عورت ذات بہتیرا دل کڑا کرتی تھیں۔ مگر ہزاروں قسم کے وہم دل میں چلے آ رہے تھے۔

نواسا بیمار تھا، شاموں شام وہاں سے آئی تھیں کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ "الٰہی خیر" کہہ کر اٹھیں اور درود شریف پڑھتی دروازے تک آئیں، پوچھا "کون ہے بھائی؟ کہاں سے آئے ہو؟"

انعام: "جناب میں ہوں۔"

خالہ: "میں کون؟"

انعام: "اجی جناب میں حاضر ہوا ہوں۔"

خالہ: "ارے بھئی تم کون ہو، کہاں سے آئے ہو؟"

انعام: "آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟"

خالہ: "بھئی کیا نام ہے تمہارا؟"

انعام: "کیا عرض کروں! غلام کو انعام کہتے ہیں۔"

خالہ نے کنڈی کھولی ڈیڑھ برس کے بعد صورت دیکھی تھی اور نواسے کی بیماری سے پہلے ہی پریشان تھیں، حضرت کے آنے سے اور مصیبت میں اضافہ ہوا، کہنے لگیں۔

"بیٹا خیر صلاح آدھی رات کے وقت کیسے آئے؟"

انعام: "جی ہاں، خیر صلاح ملنے کو جی چاہ رہا تھا، اس لئے آ گیا۔"

خالہ: "بیٹا تمہارا گھر ہے شوق سے آؤ مگر اس وقت کا آنا تو خالی نہیں کوئی بات ہے۔"

انعام: "آپ گھبرائیں نہیں، کوئی کھٹکے کی بات نہیں ہے صبح سے آنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ مگر سودے سلف میں اٹکا رہا۔ اب چھٹکارا ہوا تو میں نے کہا پہلے آپ کے پاس ہو آؤں۔"

خالہ: "آؤ میاں شوق سے آؤ تمہاری صورت ہی کو ترس گئے۔ اماں کیا مریں تمہاری طرف سے سارا کنبہ ہی مر گیا، کہو دلہن بیگم تو اچھی ہیں، بنجارے سے سنا تھا، اللہ رکھے پاؤں بھاری ہے، کب تک ہوگا؟"

انعام: "اسی غرض سے تو اس وقت حاضر ہوا ہوں مجھے تو خبر بھی نہیں کیا کیا ہوتا ہے۔ کل گود بھرائی کی رسم ہے، اب آپ ہی بزرگ ہیں اس کام کو حل کر دیجئے۔"

خالہ: "بیٹا آنکھوں سے، اللہ چاہے صبح ہی آجاؤں گی۔"

انعام: "مجھے ایک اور بات بھی عرض کرنی تھی۔"

خالہ: "ہاں کہو، شوق سے۔"

انعام: "مجھے تو اس کی خبر تھی نہیں کہ یہ موقع کل ہی ہے، شام کو معلوم ہوا ہے کہ دنوں میں گنجائش نہیں تنخواہ ابھی آئی نہیں کچھ روپے کی بھی ضرورت ہے۔"

خالہ: "کیا مضائقہ ہے، تمہاری بہن کے روپے رکھے ہیں لیجاؤ، رکھے رکھے بچے تھوڑی دیں گے۔ مگر دُور بہت ہیں صبح کو نکال دوں گی۔"

انعام: "تکلیف تو آپ کو ضرور ہوگی لیکن اس وقت دیدیجئے تو اچھا ہو کیونکہ لوگ جمع ہو گئے ہیں اور اس وقت بھی کچھ کام کرنے ہیں۔"

خالہ بیچاری اگلے زمانہ کی آدمی کبھی کبھار تو بھانجہ گھر آیا، انکار نہ کر سکیں ڈبیا جلا کر کوٹھری کھولی۔ اندر گئیں، پٹی اُتاری، برتن اُٹھائے، صندوق کھولا، صندوقچہ نکالتی تھیں کہ صندوق کا پٹ ادھر سے سر پر آکر گرا، چکرا کر بیٹھ گئیں، دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔ آدھ گھنٹہ میں جا کر ٹھیک ہوئیں تو صندوقچہ نکالا اور پوچھا "بیٹا کتنے روپے لوگے؟"

انعام: "دوسو روپے دیدیجئے۔"

ایسے ایسے دوسو روپیہ نہ معلوم انعام کے ہاتھ میں کے سو مرتبہ آئے اور گئے ہوں گے، مگر اس وقت دوسو روپے نہ معلوم کتنی اشرفیاں تھے۔ خوشی کے مارے اچھل پڑا خالہ غریب منتظر ہی رہیں کہ شاید ایک دفعہ تو جھوٹ موٹ ہی سہی منہ چھونے کو اور بھی کہے کہ سویرے سے آئیے گا۔ مگر کیسا بلاوا اور کس کا دکھاوا۔ روپیہ رومال میں باندھ سلام علیک بھی تو نہ کی۔ اور یہ جا وہ جا۔ گھر پہنچا تو بچوں کی چیخم دھاڑ، بڑوں کا غل غپاڑہ، کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی، اندر گیا تو بیوی گم سم پڑی تھیں، روپوں کی

پوٹلی ہاتھ میں دی تو ذرا جان میں جان آئی کسمسائیں اور کہا "تم تو جا کر بیٹھ ہی گئے گیارہ بج رہے ہیں۔ پان چھالیہ کا آگا ناگا تو خدا بیچاری اماں کا بھلا کرے انھوں نے لے لیا۔ دو ڈھولیاں ختم ہو چکیں، چاروں طرف سے کھانے کی دُہائی پڑ رہی ہے۔ اب اس وقت تو میں جانوں بازار کا خمیری روٹی سالن لادو۔"

شام کا بھرتا بھرآتا جوتیاں چٹخاتا، دھکّے کھاتا گھر آیا تو کمر بھی سیدھی کرنی نصیب نہ ہوئی اور پھر جانا پڑا سو سوا سو عورتوں کا کھانا بچّے اور مامائیں الگ رہیں منہ کا نوالہ نہ تھا ایک تو وہ حکم دینے والی کہ جو سمجھ میں آیا کہدیا۔ ایک وہ تعمیل کرنے والے کہ جو بیوی نے کہدیا کان دبا چلتے ہوئے۔ بازار پہنچے تو نان بائی دُکان بڑھانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ کہنے لگا "مولوی صاحب آدھی رات کا وقت دو من روٹی اگر ٹکڑا ٹکڑا فی دُکان مانگو گے جب بھی نہیں ہو سکتی۔ کھانے والے کھا چکے، بیچنے والے بیچ چکے۔ تنور ٹھنڈے ہوئے پکانے والے سو گئے، آپ نے بھی کمال کیا دن بھر کیا پڑے سو رہے تھے۔ جو اب آئے ہو۔"

انعام: "بھائی اس وقت تو جس طرح ہو انتظام کرو نہیں تو سارے مہمان فاقہ سے سوئیں گے سُسرال کا معاملہ ہے وہ ناک کٹے گی کہ الٰہی توبہ!"

نان بائی: "صاحب سُسرال کے لوگ ہوں یا میکے کے میرے بس کا تو روگ ہے نہیں۔"

انعام: "خانصاحب اس وقت تو ہماری شرم تمہارے ہاتھ ہے کچھ ہی کرو، مگر مہمانوں کے پیٹ میں ٹکڑا ڈال دو۔"

نان بائی: "اجی مولوی صاحب آپ تو خواہ مخواہ مجکو ذلیل کر رہے ہیں بھلا اس وقت میں کیا کر سکتا ہوں۔ خیر یہ سوچ لیجئے دُو گنے دام ہوں گے۔"

انعام: "جو کچھ بھی ہو مگر تم کام شروع کرو۔"

دُو من روٹی اور اس کے ساتھ سالن، گڑیوں کا کھیل نہ تھا۔ دو تو دکان ہی پر

بج گئے، لیکر آیا تو تین بج رہے تھے، دن بھر وہ آفت بھگتی، رات بھر یہ مصیبت جھیلی مگر اس وقت تو ندامت کے سوا کسی چیز کا ہوش نہ تھا، گھر آیا تو سناٹا۔ کوئی اتنا نہیں کہ ہاتھ تک لگوائے، مہمان اور میزبان سب سناٹا رہے تھے، بیوی کو جگایا، ساس کو ہشیار کیا، غرض دستر خوان بچھتے بچھتے چار بج گئے۔"

چوتھا باب

انعام غریب کو روٹی تو کیا خاک نصیب ہوتی، یہ بھی غنیمت تھا کہ لیٹ جانے کی مہلت مل گئی، سوچا یہ تھا کہ آنکھ لگ جائے گی، گھنٹہ دو گھنٹہ آرام کروں گا، مگر نیند کہاں صبح کا سہم سر پر سوار تھا۔ اسی ادھیڑ بن میں صبح ہوگئی تو پہلا مرحلہ ناشتہ کا تھا وہ طے کیا۔ کھانے کا انتظام رات ہی کر لیا تھا۔ مگر سات بجے تک بیر جی کے جوڑے کے دو تقاضے آچکے تھے۔ دکانیں بھی نہ کھلی تھیں کہ جا پہنچا۔ واپسی میں چچا زاد بہن کا گھر پڑا صادقہ کہنے کو بچی، دیکھنے میں لڑکی اور ظاہر میں کمسن ناتجربہ کار تھی۔ مگر قدرت کی زبردست طاقت کا جلوہ اس کی ہستی میں جھلک رہا تھا۔ بڑے باپ کی بیٹی تھی اونچے گھر میں بیاہی گئی، ماں باپ کی چہیتی تھی، ساس سسروں کی عزیز ہوئی، میکے کی سرتاج تھی سسرال میں راج کیا۔ تین ساڑھے تین سال شاندار زندگی بسر کرنے کے بعد پے در پے کچھ ایسے اتفاقات پیش آئے کہ امارت تو در کنار روانت کہیدنے کو تنکا تک نہ رہا۔ انعام کو علم تھا کہ ایک گھر پر حکومت اور خاندان پر سلطنت کرنے والی بیگم آج دو دو دالوں کو محتاج ہے۔ گھر پر جا کر آواز دی تو معلوم ہوا کہ گلی میں رہتی ہے۔ وہاں گیا تو ٹوٹی ہوئی کچی دیہ اریں اور پرانے کواڑ مصیبت ماری بہن کی غربت کا پتہ دے رہے تھے۔ کنڈی کھٹکھٹائی تو ایک عورت نے دراڑوں میں آکر جھانکا اور کہا "اندر آجاؤ"۔ اندر گیا تو عجب سماں تھا، ماں باپ کی پیاری اور سسرال کی راج دلاری اس ٹوٹے ہوئے کھنڈر میں زندگی بسر کر رہی تھی میلے چکٹ کپڑے جابجا پیوند چاروں طرف سے دوپٹہ سمیٹ کر اوڑھا کہ پائجامہ کے پیوند

ظاہر نہ ہوں اور سلام کو جھک گئی، انعام نے تین برس بعد صادقہ کو دیکھا اس کا اگلا دور دورا اور عروج آنکھوں کے سامنے تھا کل کی بات تھی کہ گوندنی کی طرح زیور میں لدی اعلیٰ اور نفیس لباس پہنے تین تین چار چار ماما ئیں آگے، راج کر رہی تھی، آج وہ سماں کوسوں دور تھا، اور اس عیش کی یادگار صرف وہ دیکھنے والے رہ گئے تھے جنہوں نے انقلاب کی اس تصویر کا اقبال اس طرح پامال ہوتے دیکھا، دو پونے دو برس کا ایک بچہ گود میں تھا اور ننھی سی جان خدا کی نشان یاد دلا رہی تھی کہ جس کی پیدائش پر ہیلیوں جوڑے غربا کو تقسیم ہوئے، اب کڑکڑاتے جاڑوں میں صرف آفتاب اس کے جسم کو سردی سے بچاتا! چاہتی تھی کہ پان بنا کر بھائی کو دوں، مگر خیال آیا کہ خود ہی شام سے خالی زردہ کھا رہی ہوں، پٹاری میں پان اللہ کا نام۔ اس وقت صادقہ کی حالت عجیب تھی، ندامت کے مارے زمین میں گڑی جاتی تھی۔ آنکھیں نیچی زبان بند، ہاتھ پاؤں ساکت، ایک بیجان جسم تھا جو سامنے کھڑا تھا دو تین لمحہ یہی حالت طاری رہی اور پھر انعام نے کہا:۔

"یہ تمہاری حالت میں کیا انقلاب ہو گیا سید صاحب کہاں ہیں؟"

صادقہ" ان کا انتقال ہو گیا مقروض تھے جو کچھ چھوڑا سب قرض میں چلا گیا"

انعام" مجھے تو اس کا علم ہی نہیں"

صادقہ" اپنی اپنی پریشانیوں میں سب گرفتار رہتے ہیں کس کے پاس اتنا وقت ہے کہ دوسروں کی پریشانیاں معلوم کرے، آپ کے ہاں خیریت ہے؟"

انعام" خدا کا شکر ہے آج تمہاری بھابی جان کی گود بھرائی ہے تمہیں لینے آیا ہوں"

صادقہ" خدا مبارک کرے میں نہایت خوشی سے چلتی، لیکن اب میں اس قابل نہیں رہی" اتنا کہہ کر صادقہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے مگر ضبط کیا اور کہنے لگی" انشاء اللہ اور کسی موقع پر شرکت کی کوشش کروں گی"

انعام" میرا جی یہ چاہتا ہے کہ تم آج ہی شریک ہو۔ تھوڑی دیر کے لئے چلی چلو،

ایسا ہی ہے تو شام کو چلی آنا۔"

صادقہ:"دیر کا خیال نہیں ہے کچھ اور سبب ہیں جن کی وجہ سے میں اس وقت مجبور ہوں۔"

انعام:"تم یقین کرو تمہاری شرکت سے مجھے بیحد خوشی ہوگی اور تمہارا انکار مجھے اس مسرت سے محروم کرتا ہے۔ جس کی میں تم سے توقع رکھتا ہوں۔"

صادقہ: حقیقت یہ ہے کہ جس شخص نے عمر بھر کی رفاقت کا وعدہ اور ہمیشہ ہمیشہ کی پناہ کا اقرار کیا تھا اس کی مفارقت میری تمام امیدوں کو ختم کر گئی، خدا اس کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، میرے دل میں اب کوئی ارمان باقی نہیں۔ ہاں میرے چلنے سے اگر آپ کو خوشی میسر آسکتی ہے تو میں بسر و چشم حاضر ہوں، جس طرح بیٹھی ہوں چلی چلوں گی مگر انعام بھائی تمہارے سسرال کے لوگ بھرے ہوں گے۔ میرے اس طرح چلنے سے آپ کی بے عزتی ہوگی میرا خیال نہ کیجیے، آپ اپنی عزت اور بے عزتی کو سوچ لیجیے۔"

انعام:"کیا کہہ رہی ہو۔ صادقہ! مُول اور ذلت انسان کے واسطے عزت نہیں تم تمام خاندان کے واسطے مایۂ ناز ہو کہ باپ دادا کی لاج بڑوں کی آن بان لئے بیٹھی عزت آبرو سے۔ زندگی بسر کر رہی ہو، میں ڈولی لاتا ہوں تمہارے چلنے سے ہمارا گھر منوّر ہو جائے گا۔ اور یہ چھوٹی سی شادی یقیناً تم جیسی خاتون کی شرکت پر فخر کرے گی۔"

صادقہ اپنے بوسیدہ مکان سے چل کر بھائی کے ہاں پہنچی تو کیا دیکھتی ہے کہ عالی شان محل سراہیوں سے کھچا کھچ بھری ہے۔ سونے چاندی کے زیور، گوٹے ٹھپّے کے کپڑے چاروں طرف جگمگا رہے ہیں، ظاہری ٹیپ ٹاپ اور زرق برق پوشاکوں نے گھر بھر کی رونق دوبالا کر دی ہے صادقہ اس آرائش ظاہری سے قطعاً محروم تھی، مگر اس کا دل مسرت حقیقی سے لبریز اور دل عارضی جلوؤں پر ہنس رہا تھا۔ بھاوج کی طرف سلام کو چلی مگر کپڑے میلے تھے۔ جواب تو مل گیا لیکن ادر نہ ملا۔ بچہ کو لئے باہر انگنائی میں ایک پرانے تخت پر بیٹھ گئی، کھانے کا وقت آیا تو کیسی خاطر اور کس کی مدارات

کسی نے جھوٹوں بھی بات نہ پوچھی۔ بھاوج کی اس غفلت کا احساس فطرت تھی۔ مگر اس کے سوا چارہ کیا تھا کہ جب بچہ بھوک سے بیتاب ہو کر زیادہ بھُرکا تو بہلا کر سُلا دیا اور اور خاموش ہو گئی، دن بھر مارا مار پیر جی کا جوڑا تیار ہوا۔ شام کو گودبھرائی ہوئی تو ھاجرہ کی بڑی بہن کی چار سال کی بچی کے دونوں دہکتے ہوئے سونے کے کڑے کسی نے صاف تیر کر دئے۔ گھر بھر میں ڈھنڈیا مچ گئی کونہ کونہ اور چپہ چپہ دیکھ ڈالا۔ مگر کہیں تو ہے کے کڑے سوئی تھوڑی ہی تھے کہ چھپ جاتے دفعتہً پیر جی کے آمد کا غلغلہ بلند ہوا تو سب بیویاں جدھر جس کا منہ اُٹھا کونے کھدروں میں جا گھُسیں، پیر جی آئے تو دسترخوان بچھنے کی تیاریاں ہوئیں لیکن اُنھوں نے منظور نہ کیا اور کہا :۔

"میں تو صرف آدھی رات ایک ٹکیا جوار کی کھاتا ہوں تم لوگوں کا اِصرار تھا اس لئے آگیا۔"

ھاجرہ کی ماں۔ ہمارا تو منہ نہیں کہ حضور کا شکریہ ادا کریں، آپ ہی کی جوتیوں کا صدقہ ہے کہ خدا نے یہ دن دکھایا۔ ہم تو نااُمید ہو چکے تھے۔ اب دیا ہے تو عمر کا دیجئے گا، چراغ کا جو حضور نے حکم دیا تھا جلا دیا ہے۔"

پیر جی۔ سب دیکھ لی جائے گی تم لوگ پہلے تو احتیاط کرتے نہیں پیچھے ہم کو ستاتے ہو، ہم کو ھاجرہ کے علاج میں بہت دِقّت ہوئی، بڑی مشکل سے ظالم قبضہ میں آیا ہے۔"

ھاجرہ کی ماں۔ خدا حضور کی عمر دراز کرے۔ ہماری تو کھال کی جوتیاں بھی حضور پہنیں تو عذر نہیں۔ یہ کپڑے حضور کے لائق تو نہیں ہیں۔ مگر ہمارا دِل بڑھ جائے گا۔"

پیر جی۔ "اچھا اگر تمہاری یہ ہی خوشی ہے تو خیر کسی نہ کسی کے کام آہی جائیں گے۔"

ھاجرہ کی ماں۔ "حضور آج ایک اور واردات ہو گئی، ابھی ابھی حضور کے آنے سے ذرا پہلے کسی کمبخت نے بچی کے کڑے اُتار لئے، کس نے کیا ہم کو خود اچھی طرح معلوم ہے۔ اب حضور وہ نکلوادیں۔"

پیرجی (کچھ تامل کے بعد) ابھی تو کڑے اس کے پاس موجود ہیں، اس سے کہہ دو اگر ہنسی خوشی نہ دیئے تو تیس نہیں کردوں گا، کیوں تم ایسے چوروں کو گھر میں گھسنے دیتے ہو؟

ہاجرہ کی ماں: "حضور سگے چچا کی بیٹی ہے، اس لئے بلا لیا تھا۔ صادقہ ارے صادقہ! یہاں تو آ حضور فرما رہے ہیں اگر سیدھی طرح کڑے نہ دیئے تو غارت کردوں گا۔"

پیرجی: "ایک کوری بدھنی پانی بھر کر لاؤ، کاغذ قلم دوات دو اور سب مہمانوں کے نام لکھوا دو میں ابھی چور کا نام نکال دیتا ہوں"

پانی بھری ہوئی بدھنی، ایک طرف پیرجی نے، دوسری طرف سے انعام نے انگلی پر رکھی اور پیرجی پڑھتے گئے، ٹونٹی میں ایک ایک کر کے ناموں کے پرزے ڈالتے جاتے تھے، ایک نام پر بدھنی نے گردش کی پرزہ نکال کر دیکھا صادقہ نام تھا، پیرجی کی فال اور کچھ چوری چھپے نہیں سب کے روبرو دہر ایک کے سامنے اب صادقہ کو چور سمجھنے میں کیا کسر رہ گئی تھی یقین کامل ہو گیا۔ اپنے اپنے طور پر سمجھا بجھا کر ڈانٹ ڈپٹ کر غصہ سے پیار سے جس سے جس طرح ہو سکا کڑوں کے نکلوانے کی کوشش کی جب کامیابی نہ ہوئی تو خود انعام نے کہا:۔

"صادقہ! دو چار روپیہ کا مال ہوتا تو مضائقہ نہ تھا۔ چار ساڑھے چار سو کے کڑے ہضم کر لینے آسان بات نہیں ہے میں خدا سے ڈر کر اور تم پر رحم کھا کر لایا تھا یہ خبر نہ تھی کہ تم اللہ کی عنایت سے سب گنوں پوری ہو، اور ایسا کلیجے میں ہاتھ ڈالو گی کہ سب تڑپتے رہ جائیں گے اتنا کچھ کہا جا رہا ہے اور تم پر خاک اثر نہیں ہوتا، یہ میں جانتا ہوں کہ بچی نہیں دھاڑی چور ہو، پہلا موقعہ نہیں کہ ڈرانے میں آجاؤ گی۔ مگر یاد رکھو میں بھی داروغہ ہوں دم بھر میں اگلوا لوں گا ابھی تو منہ ہی سے کہہ رہا ہوں، پھر تم جانتی ہو میرا غصہ کیسا ہے۔ اب بھی کچھ نہیں گیا۔ کسی بہانہ سے ادھر ادھر ڈال دو آئندہ تم کو اختیار ہے"

صادقہ کو اس وقت دین و دُنیا کسی چیز کا ہوش نہ تھا، آنکھیں نیچی تھیں جن سے زار و قطار آنسو بہہ رہے تھے۔ اس کی گود میں بچہ بیخبر پڑا سوتا تھا۔ وہ ساکت تھی۔ خاموش تھی اور بس نہیں چلتا تھا کہ زمین میں گڑ جائے، سینکڑوں بیویوں کی نگاہیں اس کے چہرہ پر تھیں اس کی حالت ظاہری اس کے میلے کچیلے کپڑے، اس کا افلاس و مصیبت چوری کا پورا یقین دلا رہے تھے، اس کے دِل میں رہ رہ کر جوش اُٹھتا تھا اور سوچتی تھی اب اس سے زیادہ نازک وقت اور مصیبت کا دِن کیا ہوگا، شوہر گیا، دولت گئی، چین گیا، آرام گیا، پہننے کو چیتھڑا نہ رہا، رہنے کو جھگی نہ رہی، ماں باپ ساس سُسرے سب رخصت ہوئے۔ ایک تھوڑی سی آبرو باقی تھی آج وہ بھی چلی۔ جو لوگ عیش کرتے دیکھتے تھے جن آنکھوں نے گھروالی اور بااختیار دیکھا تھا اب ان کے سامنے چور بنی کھڑی ہوں، اللہ اللہ کیسا درد انگیز سماں ہے! دفعتہً اس نے آنکھ اوپر اُٹھائی، انعام کی طرف دیکھا اور کہا:۔

"کچھ شک نہیں خدا نے آپ سب کو جو عزت دی ہے میں اس وقت اس سے محروم ہوں، میری بابت جو کچھ کہا جائے ٹھیک ہے، میں مفلس ہوں، مجھ پر الزام لگ سکتا ہے، بے وارثی ہوں جس کا جی چاہے کہہ لے، آپ کے گھر پر ہوں، جو کچھ سُنوں درست، آپ کے قبضہ میں ہوں، جو کہا جائے ٹھیک، مگر وہ بدنصیب جس نے خدا سے کیا کسی بندے سے بھی کبھی جھوٹ نہ بولا تم کو یقین دلاتی ہے کہ چھ پہر کی بھوکی صرف اس کونے میں بیٹھی رہی، میں نے تمہاری خوشیاں، تمہاری رسمیں آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھیں، تم نے مجھ کو گھر پر بلا کر میری آبرو لی، میں بگیناہ ہوں، گو اس قابل نہیں ہوں کہ تمہارے برابر بیٹھ سکوں، مگر چور نہیں ہوں، میں نے تمام عمر کبھی قسم نہیں کھائی لیکن اس وقت کہتی ہوں کہ میری بے گناہی کا شاہد صرف وہ ہے جس کی نگاہ میں میرا افلاس اور تمہارا تمول دونوں برابر ہیں، سب کھو چکی میرے سر سے وارث اُٹھ گیا، میری جائداد

برباد ہوئی میری کمائی لٹ گئی لیکن عمر بھر کی پونجی، زندگی کا سرمایہ دنیا کی کل کائنات صرف یہ ایک معصوم لال میری گود میں ہے، تم صاحبِ اولاد میری بات کی قدر کرو۔ میں اس بچہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہتی ہوں میں نے تمہارے کپڑے نہیں لئے، میں جب سے آئی ہوں تمہارے گھر سے باہر نہیں نکلی، میں تنہا ہوں، میرا بچہ بغیر میری مدد کے چل بھی نہیں سکتا، تم میری تلاشی لے لو اور اس جرم کی سزا دو کہ جب میں اس لائق نہ رہی تھی تو کیوں تم لوگوں کی خوشی میں شریک ہونے کی خواہش مند ہوئی، مجھ کو گھر سے نکال دو، میرے پاس کچھ نہ تھا، ہاں تھوڑی سی عزت باقی رہ گئی تھی وہ یوں ختم ہو گئی، باپ دادا کی وقعت، بزرگوں کی آن، شوہر کی لاج، سسرال کی عزت اس وقت مجھ بدنصیب نے گنوا دی، میری مصیبت ہمدردی کی محتاج ہے۔ اپنے بچوں کا صدقہ مجھ کو اب زیادہ رسوا نہ کرو، اگر تمہارا ظلم صرف میری ذات تک رہتا تو شکایت نہ تھی، تم نے اس بے زبان پر اس ننھی سی جان پر، اس معصوم روح پر ستم توڑا، اگر یہ زندہ رہا تو اس کی عمر برباد ہوئی عزیز اس سے نفرت کریں گے، دوست اس پر لعنت بھیجیں گے، اور ماں کی چوری اس کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہوگی، تم با اختیار ہو، قدرت رکھتے ہو، عزت رکھتے ہو، خدا نے تم کو دولت دی، حکومت دی، اطمینان دیا، راحت دی، جس نے تم کو خوشی کا دن دکھایا، اسی کا واسطہ دیتی ہوں، میرے در پے نہ ہو، میں دنیا کی بدترین مخلوق اور انقلاب کی بہترین تصویر ہوں، میرا دل زخمی ہے، میرے زخم ہرے ہیں، میرا کلیجہ چھلنی ہے۔ میرے داغ تازے ہیں، میں بے بس ہوں، بیکس ہوں، دکھیاری مصیبت ماری، میری حالت قابلِ رحم ہے۔ مجھ پر رحم کرو میں تمہاری عنایت و کرم کی محتاج ہوں، بے قصور ہوں، میں نے تمہارے کپڑے نہیں دیکھے۔ الغام

بھائی میرے وارث شرعی ہو، خدارا مجھکو بچاؤ، اس مصیبت سے نجات دلواؤ میری مشکل آسان کرو، اللہ تم پر رحم کرے گا۔ میں عہد کرتی ہوں کہ آج کے بعد اب کہیں آنے جانے کا نام نہ لوں گی، مجھ کو ڈولی لادو میں چلی جاؤں۔"

پیرجی "کیا چاتر عورت ہے۔ قینچی کی طرح زبان چل رہی ہے۔ خدا کا کلام جھوٹا ہم جھوٹے، کم بخت چور مکار!"

جس جس کے منہ میں جو جو کچھ آیا کہنے میں اور سنانے میں کمی نہ کی، بدنصیب حسرت سے ایک ایک کا منہ تکتی تھی کہ شاید کوئی اللہ کا بندہ ایمان کی بھی بولے۔ مگر چاروں طرف سے لعنت و پھٹکار پڑ رہی تھی۔ گیارہ بجے کے قریب نذر و نیاز ہو چکی تو پیرجی اپنا جوڑا نقد روپے اور کھانا لے کر چلتے ہوئے، مگر چلتے چلتے اتنا اور کہہ گئے "خدا کی شان ہے، ولیوں کے ہاں بھوت مولویوں کے ہاں ایسی سپوت لڑکی پیدا ہو جو اچھے اچھے داڑھیوں کے کان کترے صبح تک راہ دیکھ لو، دبدے تو خیر نہیں تو تھانیدار کے سپرد کر دینا۔"

تھانیدار کا نام سنتے ہی صادقہ تھرا اٹھی جانتی تھی کہ پیرجی کا حکم ٹل نہیں سکتا صبح ہوتے ہی تھانیدار آجائے گا، اس بکرے کی طرح جو قصائی کی آبدار چھری سے ڈر کر چاروں طرف چھپنے کی کوشش کرے تھر تھر کانپ رہی تھی، ہر طرف نگاہ دوڑاتی تھی۔ مگر کوئی نظر نہ آتا تھا کہ اس آڑے وقت میں کام آجائے۔ پیٹ میں ہول اٹھ رہے تھے، اٹھتی تھی، ٹہلتی تھی سوچتی تھی بیٹھتی تھی، خیال آیا کہ مجھ سے زیادہ بدنصیب، مجھ سے بڑھ کر بے عزت کون ہوگا۔ دنیا کو موت آرہی ہے کیسے کیسے پیارے آنکھوں کے سامنے سے اٹھ گئے۔ اور میں کم بخت اس دن کو زندہ رہ گئی کہ باپ دادا کی ناک کاٹ دوں، تیری شان تجھی کو سزاوار ہے۔ جس کی پالکی پر دوہرے پردے پڑے دیکھے اسے تھانیدار کے سامنے برقع بھی نصیب ہوتا ہے یا نہیں۔ اوپر نگاہ اٹھا کر دیکھا تو آسمان کے موتی جگمگا رہے تھے۔ سجدہ میں گری اور گڑگڑا کر کہا: "آقا! بدنصیب لونڈی تیرے حضور میں حاضر ہے۔ رات آدھی سے زیادہ گذر چکی دنیا بے خبر ہے مگر

تو بالجبر سوتے ہیں اور تو جاگتا ہے صبح قریب ہے اور آرہا ہے وہ وقت جب ایک غیر مرد کا آمنا سامنا اور دنیا محرم نگاہیں میرے چہرے پر ہوں گی جس کا پتہ بھی محلہ والوں نے نہ دیکھا، جس کی پرچھائیں تک نوکروں کو دیکھنی نصیب نہ ہوئی آج دنیا اس کے ساتھ یہ سلوک کرتی ہے۔ اس وقت ظالموں سے بچانے والا کوئی نہیں۔ مولا تیرے سامنے آئی ہوں، میری فریاد سن، دلوں کا حال دیکھنے والے! آنے والا وقت مجھکو نہ دکھا، بچا۔ مولا بچا۔"

ماں باپوں کی بیٹیاں اور عفت و عصمت کی وہ دیویاں جن کے دامنوں پر فرشتے نماز پڑھیں زندگی کی کسوٹی پر سونے کی طرح چمکیں اور کندن کی طرح دمکیں، صادقہ بظاہر بے وارثی محتاج، فقیرنی سبھی کچھ تھی مگر اس کے میلے کپڑوں پر مصالحہ دار پوشاکیں قربان، اس کے افلاس پر تمول نثار اور اس کے ننگے بدن پر جڑاؤ جھمارے بائے فدا تھے، اس کی التجا دکھتے ہوئے دل سے نکلی اور عرش بریں پر پہنچی، کہتے ہیں زخمی دل کی صدا خالی نہیں جاتی، یہ ننھا یا جو کچھ تھا بھائی کی جانب سے نا امید ہو کر جب حقیقی وارث سے التجا کی تو اس کی دعا قبول ہوئی، سجدے میں تھی کہ جی متلا یا قے ہوئی۔ دست آیا ایک تین ہی گھنٹہ میں دو دن کی بھوکی مہمان کی حالت بھائی کے در پر خراب ہونی شروع ہو گئی، تین بجے کے قریب جب زیادہ طبیعت بگڑی اور اٹھنے کی طاقت نہ رہی تو بچہ کی مفارقت کا خیال آیا، دل نے بے ساختہ صدا دی کہ کلیجے کا ٹکڑا ماں کے مکھڑے سے ہمیشہ کو چھوٹتا ہے۔ پرورش تو در کنار کوئی اتنا بھی نہیں کہ سر پر ہاتھ پھیر دے گا، کچھ عمر بھی تو نہیں، نگوڑا تیسرے ہی سال میں ہے بات بھی تو کرنی نہیں آتی۔ آج اس کی ضدیں اور ہٹیں سب ختم ہوتی ہیں۔ ابھی میرے ہوش و حواس درست ہیں۔ ایک دفعہ کلیجے سے لگا لوں، آمیری جان آ پیارا کی نگاہیں اور محبت بھری نظریں آج ہمیشہ کو بند ہوتی ہیں۔ چھاتی سے لگانے والی ماں اور اس چاند سے مکھڑے پر قربان ہونے والی خدمت گزار رخصت ہوتی ہے۔ لپٹ لوں لپٹا لوں کوئی اتنا نہیں جس کے ہاتھ میں ہاتھ دوں، خیر سب سے بہتر وارث خدا ہے پیاس کی

شدت زیادہ ہوئی اُٹھنے کا ارادہ کیا تو ہمّت اٹھی بھی مگر دو ہی قدم چلی تھی کہ چکر آیا اور دھڑ سے گری بس بائیس برس کی زندگی کا نتیجہ صرف ایک بچّہ تھا جو اس وقت ماں کے پاس تھا، اسی کا سہارا لے کر اٹھی اور پھر لیٹی اس کے ننھے ننھے ہاتھ اُٹھا کر آنکھوں سے لگائے پیار کیا گلے میں ہاتھ ڈال کر زور سے بھینچا کہنے لگی "الٰہی زندہ رکھنا ہے تو عزت سے ورنہ بے عزتی کی زندگی سے موت بہتر"

مؤذن اذان دے رہا تھا کہ دروازے پر چند آدمیوں کی آواز آئی اور ایک شخص نے باآوازِ بلند کہا "مولانا باہر آئیے۔ تھانہ دار صاحب آئے ہیں یہ آپ کی ماما کڑے بیچتے ہوئے پکڑی گئی ہے" تھانہ دار کا نام سنتے ہی صادقہ کی حالت اور بھی ردّی ہو گئی، بھائی کو پاس بلا کر ہاتھ جوڑے اور کہا "خدا کا واسطہ رحم کرو تمہارے کڑے نہیں لیے"۔

پانچواں باب

خالہ سے روپوں کا وعدہ تنخواہ کا تھا تنخواہیں ایک چھوڑ دو بلکہ تین آئیں مگر قرضہ نہ اُترا اور نہ اترتا کہاں سے جتنا آتا اُس سے زیادہ اُٹھتا دس دس دن پہلے بلوں بلوں بچ جاتی۔ پیر جی کی کرتو لگی ہوئی تھی اس کے علاوہ ستوانسا ہوا، اٹھوانسا ہوا، نوماسہ ہوا، گوند بنا، ستھورا بنا، پنجیری بنی، گھر گرہستی کے ٹنٹیارے، خالہ بیچاری کون سی لکھپتی تھیں کہ اتنی بڑی رقم کو صبر کر کے بیٹھ جاتیں، دو مہینہ تو چپ رہیں کہ شاید اب بھی آجائے اب بھی آجائے مگر آئے کہاں سے اور جائے کیوں کر! مجبور غریب نے تقاضہ کیا! انعام ادا کرنے کی قرض سے مجبور ضرور تھا، مگر غافل نہ تھا۔ دو ایک وعدے کیے مگر ایک بھی پورا نہ ہوا۔ اب تو خالہ کے بھی کان کھڑے ہوئے عورت ذات تھوڑا دل پوری رقم، ڈاک بٹھا دی صبح شام دن، دوپہر ہر وقت ماما تقاضے کو کھڑی ہے۔ انعام کی زندگی کا یہ دور بھی عجیب بہار کا زمانہ تھا، قرضہ کا انبار اس کے سر پر، زچہ خانہ کا بار اس کے سر پر، عقیقہ کا پہاڑ، اس کے سر پر، ایک دم پر اتنے غم سوار تھے اسے کھجانے کی فرصت نہ تھی، مگر ان آلام اور افکار

پر بھی نہ انتظام کی کوئی توقع تھی نہ انسداد کی کوئی اُمید۔ چاہیے تھا کہ اب بھی ھاجرہ کی آنکھیں کھل جاتیں، لاحول ولا قوۃ الا باللہ وہ تو اس گھر تھی ہی نہیں، تفکرات کا ہجوم یہ کچھ تھا۔ مگر پاؤں پھیرنے کی رسم پھر دھوم سے ادا ہوئی۔ ٹھی گرویں پڑی تو بلا سے مگر دیگیں تو کھڑک گئیں!

عید سے خالی، خالی سے بقرعید، دو تین مہینہ تو وعدے وعید میں ٹل گئے، مگر اس کے بعد خالہ نے تقاضا شدید کیا تو انعام عجیب مصیبت میں تھا، زچہ خانہ کے اخراجات پر نظر ڈالتا تھا تو ڈھائی سو سے کم نہ تھے، عقیقہ پر غور کرتا تھا تو چار سو کم اس کی بھینٹ نہ تھی، خالہ کے تقاضوں نے الگ ناک میں دم کر رکھا تھا۔ عجیب پریشانی کا عالم تھا، کچھ کرتے بنتی تھی نہ دھرتے، بھوک تھی نہ پیاس، رات دن اسی فکر میں غرقاب تھا۔ خالہ کا تو خیر قرضہ تھا ہی مگر زچہ خانہ اور عقیقہ قرضہ سے بڑھ کر تھے۔ خرابی یہ تھی کہ بیوی کی طرف سے اتنا مایوس ہو چکا تھا کہ نشیب و فراز تو رہے الگ صلاح و مشورے کی بھی ہمت نہ پڑتی تھی۔ فکر میں تو وہ بہت دنوں سے تھا۔ لیکن ایک روز اتفاق سے خود ھاجرہ ہی کی طرف سے پہل ہوگئی، اور وہ بھی اس طرح کہ خالہ نے کہلا بھیجا "میں تو خیر روپیٹ کر صبر کر ہی لوں گی، مگر رانڈ کی آہ خالی نہ جائے گی۔" انعام گھر میں نہیں تھا ھاجرہ اوّل تو یوں ہی مزاج کی آگ تھی اُس پر پورے دن! سنتے ہی آپے سے باہر ہوگئی۔ ماما کو تو کوس پیٹ کر نکال دیا۔ مگر خالہ کا پیغام خوب نون مرچ لگا کر میاں تک پہنچایا تو وہ خود ہی موقع کا منتظر تھا کہنے لگا۔ "جو کہو وہ کروں۔"

بیوی۔ "کرنا تو کچھ پڑے ہی گا مگر تم جو کچھ کرو گے عین وقت پر۔ روپیہ کے دو روپے اٹھیں، اور چاروں طرف بھیک مانگو۔ ایسے ایسے کم بخت عزیز رہ گئے ہیں کہ دو سو روپوں کے واسطے منہ بھر کر کوس لیا۔ مگر کسی کا کیا قصور غلطی اپنی ہی ہے، تقاضوں پر تو اچھے تن رہے ہو اور کانوں میں تیل ڈالے بیٹھے ہو، وقت پر ایک ایک کے آگے ہاتھ پھیلاتے پھرنا۔ میں بھی چپکی بیٹھی دیکھ رہی ہوں کہ آخر کیا ہوگا، میرے خرچ کا تو خیر کچھ نہیں گھی نہ ملے گا اُبالی، سالن نہ ہوگا روکھی، گوشت نہ ہوگا دال، اچھی بری، روکھی سوکھی الشم پشتم گزر جائے گی، مگر دنیا میں

رہنا ہے جیتے تو ناک نہیں کاٹی جاتی کہ عمر بھر سب کے حصے کھائے اور اپنے ہاں وقت ہوا تو پاؤ بھر بتاشے نہ جڑا۔ پرسوں اماں نے حساب کیا تھا دو اور پڑھائی سو حصے ہیں ڈیڑھ سو روپے کے تو فقط پان بتاشے ہی آئیں گے۔ میں نے کہا تھا بی الگ کرو۔ لیکن انھوں نے ایسا آڑے ہاتھوں لیا کہ اور کہہ کر چپ ہو گئی۔ انھوں نے جو کچھ کہا سچ کہا۔ پان بتاشے تو بچاری نصیبا دکھیاری نے بھی بانٹ دئے تھے۔ اور اگر بے عزتی بن کر دہی مثل اصل کر دی کہ لینے کی پچھلی دینے کے کانٹے تو خیر عقیقہ تو اللہ کا حکم ہے وہ ٹل نہیں سکتا، یہ سب قرض حسنہ ہے۔ آخر ہم نے بھی تو سب کے حصے کھائے ہیں، کوئی مفت یا اللہ کے نام تھوڑی کھلائیں گے، یوں تو ہوت کی جوت ہے۔ مگر ہزار روپے سے کم عقیقہ میں نہ اٹھے گا۔ دو وقت کا کھانا غریب سے غریب بھی کر دیتے ہیں، وہی ہم کر دیں گے۔ یہ روپیہ آخر کہاں سے آئے گا۔ اللہ چھپر پھاڑ کر تو دینے سے رہا۔ روپیہ انتظام ہی سے ہوگا، ہو جاتا تو لگے ہاتھ ان کے بھی ادا ہو جاتے۔

میاں "ہزار وہ، دو سو یہ، تین سو اور رکھ لو، پندرہ سو روپے کا انتظام میں کیا خاک کر سکتا ہوں۔ مجھے تو اب کوئی شاید پندرہ روپے بھی قرض نہ دے گا۔ زیور بیچوں یا مکان گروی رکھو۔ یہی دو صورتیں ہیں اور کوئی سمجھ میں نہیں آتی۔"

بیوی "۔ زیور ہی کونسا دس پانچ ہزار روپے کا ہے کہ بیچ ڈالوں یہ ہی پانچ سات چیزیں ہیں جو ہر وقت تم کو کھٹکتی رہتی ہیں لیجاؤ آگ لگا دو، ننگے کان، سونٹا سے ہاتھ، بھاڑ سا گلا بیٹھ جاؤں گی۔"

میاں "یہ کیا غضب ہے کہ تم بات کو سمجھتی ہو نہیں اور لڑنے بیٹھ جاتی ہو اگر زیور علیحدہ نہیں ہو سکتا تو پھر مکان بیچ ڈالو۔"

بیوی "۔ کیوں، بکنے لگا، گروی رکھ دو۔ بلا دلال سے کہہ دو شام تک جھولی میں روپیہ ڈلوا دے گا، روپے سینکڑہ پر بھی ملا تو پندرہ روپے ہوں گے۔ جہاں اور سینکڑوں اٹھتے ہیں یہ پندرہ بھی نکلتے رہیں گے۔"

رہن مکان کی تجویز انعام کے دل میں ایسا پھوڑا تھا جس میں اصرار رہن کی گفتگو ٹیسیں چمکیں بن کر چمکی۔ رسم عقیقہ کا تھمنا اِس زخم پر نمک تھا پسینہ آگیا ہوائیاں اُڑنے لگیں، رنگ فق، آپ ڈنگ چپکا اُٹھ باہر آگیا جس پہلو پر نظر ڈالتا تھا، پریشانی، اور جس رُخ پر غور کرتا تھا حیرانی، اچھی طرح جانتا تھا کہ مکان رہن ہوا پھر چھٹنے والا نہیں دو سو روپے کا قرضہ تو چار مہینے میں ادا ہی نہ ہو سکا ڈیڑھ ہزار روپیہ کیا نکلے گا، کوئی ذریعہ نہیں اُمید نہیں، تین پشت کا مکان یوں علیحدہ کرنا آسان نہیں بڑے دادا جان نے کیسی کیسی مصیبت اُٹھا کر یہ کھنڈلا بچایا تھا چاہیئے تھا اور ضرورت کیا دُنیا کا دستور یہی ہے (اماں جان اللہ بخشے ہمیشہ کہتی تھیں۔ لونڈی بن کمائے اور بیوی بن کھائے) کہ سب ترقی کر رہے ہیں ابا جان نے چار پانچ ہزار لگا کر مکان کہیں سے کہیں پہنچا دیا، کوٹھے کا کمرہ، بیٹھک کی سنگی دو نوادھورے پڑے ہیں، ان کا بننا تو درکنار مکان ہی ہاتھ سے چلا۔ لنگڑا نہیں، لولا نہیں اندھا نہیں، اپاہج نہیں، نوکر ہوں، چاکر ہوں، کھاتا ہوں کماتا ہوں، سو روپے کی ملازمت آج اچھے اچھوں کو نصیب نہیں ہیں تو ایسے دو مکان اور بنا تا نہ کہ اگلا سارو پ بھی کھو دیا۔ رہن کی خبر کُھلیا کا گڑ نہیں کہ چپکے سے پُھوڑ لوں، سارے شہر میں پھیلے گی کس کس کا مُنہ کیلوں گا، منشی، محرر، قبالہ نویس، تحصیلدار، سب ہی واقف کار ہیں۔ کہاں جاؤں کیا کروں زیور ہوتا چپکے سے جا، بیچ آتا کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ مگر اس نیک بخت کی تو الٹی مت ہے چلیں، دلال کو ٹٹولوں تو سہی آخر کب تک منہ میں گھنگھنیاں بھرے بیٹھا رہوں گا، بکی ہنڈیا کا کیا بھروسہ، نہ معلوم کس وقت بچہ ہو جائے اور کیا صورت پیش آئے سو پچاس روپے تو گھر میں موجود رہنے چاہئیں، ابا جان تو مہینہ بھر پہلے تمام چیز بست بھر دیتے تھے میں نے اب تک خاک کچھ نہ کیا۔

بدنامی کا خیال، بے عزتی کا احتمال، فضول خرچی کا ملال، ایک عارضی ابال تھا دو چار لمحہ کے بعد ختم ہو گیا اور اب جو باقی تھا وہ بیوی کا صبر اور اپنی لاپرواہی دل ہی دل میں بُرا

بھلا کہتا، ہوی نہیں اپنے تئیں بلاّ کے مکان پر پہنچا، اور ساری واردات جانسنائی، اندھا کیا چاہے دو آنکھیں انعام کی پریشانی بلاّ کے واسطے سوکھے دھانوں میں پانی تھا۔ کہاں بلاّ خرانٹ کہ ایسے ایسے گبگلوں کو دم بھر میں چاٹ جائے اور ڈکار تک نہ لے، کُجا بچارے انعام، اپنی ہی گٹھری بیچے بکھرتے ہوں تو برقنداز کے نام سے تھرا جائیں، بلاّ وہ گھاگ کہ ایک ہی پھنکار میں صفایا کردے چھوٹتے ہی کہنے لگا "مولانا! یہ تو چٹکی بجانے کا کام تھا مگر مجبور ہوں، روپے کا تو ایسا توڑا پڑا ہے، اس لڑائی کم بخت نے کسی پاس کچھ نہ چھوڑا، مہاجن یا تو بیسیوں پھیرے کرتے تھے کہ کہیں روپیہ اٹکوا دو، یا اب ہم جوتیاں توڑیں اور بیٹھے بیٹھے ہاتھ نہ دھرنے دیں، سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتے۔ چار روپے سینکڑہ اور پانچ روپے سینکڑہ کا بھاؤ ہو رہا ہے وہ بھی جو کوئی ڈھب پر چڑھ جائے۔ خیر ایک کام کیجئے رات کو سب کاغذات مجھے دے جائیے، تو میں خدا نے چاہا تو ایک آدھ روز میں ہاں، نا کا جواب دے دوں گا۔"

انعام: "مگر مجھے تو آج ہی کل میں روپے کی ضرورت ہے۔ سود کا خیال نہ کیجئے جتنے پر بھی ہو معاملہ کرا دیجئے۔ مگر جلدی ہو جائے۔"

بلاّ: "میں نے تو جو اصل بات تھی وہ آپ سے کہہ دی، اللہ مالک ہے آپ قبالہ تو لائیے۔" بلاّ نے کچھ ایسا روکھا منہ بنا کر باتیں بنائیں کہ انعام کے ہوش و حواس جاتے رہے۔ لپکا ہوا گیا کاغذ ڈھونڈھے اور لے کر آیا تو بلاّ نے کہا "وہ سامنے قبالوں کا ڈھیر لگ رہا ہے سب گروی کے ہیں وہیں ڈال دیجئے۔"

انعام: "آپ سب سے پہلے میرا کام کر دیجئے۔ میں آپ کو خوش کر دوں گا۔"

بلاّ: "خوش کیا جناب وہ تو دس روپے سینکڑے کی دلالی مقرر ہی ہے۔ خدا آپ کا کام کردے میری خوشی تو بڑی یہ ہے۔"

انعام: "تو میں شام کو پھر آؤں؟"

بلاّ۔ میں خود ہی آؤں گا۔

انعام اس وقت تو اٹھ کر چلا آیا مگر صبر کہاں؟ اضطراب کا یہ عالم تھا کہ شام تک تین پھیرے کر ڈالے۔ رات کو پیر جی آئے تو انھوں نے کہا کہ بچہ پرسوں ہوگا۔ سنتے ہی پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ اس کو پیر جی کے ارشاد پر یقین کامل تو نہ تھا، مگر کچھ بیوی کی محبت کا اثر کچھ لوگوں کا حسن اعتقاد، ڈھل مل یقین تھا، فجر دم بلاّ کے ہاں پہنچا۔ گدھا گ کی ساری گفتگو راگ تھا۔ قبالہ موجود مکان موجود روپے کی کیا کمی۔ منہ سے نکالنے کی دیر تھی کہاروں کے پانچ اور کس کے چار، کدھر کے دو اور کیسے تین، بارہ آنے اور دس آنے پر ایک دو نہیں بیس ساہوکار دینے کو تیار ہوتے لیکن یہاں تو بات ہی اور تھی انعام جیسی آسامیاں ملتیں کس کو تھیں۔ چار روپے سینکڑہ سود، دس روپے سینکڑہ دلالی، غرض پندرہ سو کے کٹ کٹا ساڑھے بارہ سو میاں کے پلے پڑے اور اس طرح مکان رہن ہو گیا۔

چھٹا باب

دنیا کے معاملے ہوں، یا خدا کے کارخانے، وقت کی بات تھی یا زمانہ کے اتفاقات رات کے ختم ہوتے ہی پیر جی کی بات پوری ہوئی، اور ایک ننھی سی جان نے ہاجرہ کے فرمانبردار شوہر کو والد بزرگوار بنا دیا۔ ہوئی تو لڑکی، مگر اماں جان نے صرف داماد ہی سے نہیں علی الاعلان کہہ دیا کہ "مجھے تو یہ لڑکی سات لڑکوں سے افضل ہے۔ اللہ نے میری بچی کی جان بچائی"۔ زچہ خانہ کا خرچ آنکھوں والے بھی اندھا کہتے ہیں۔ جہاں خرچ بھی اندھا اور اٹھانے والے بھی اندھے وہاں کی حالت کا پتہ چھپا کیا، اخراجات کا ٹھکانا کیا محلہ بھر میں جلیبیاں، کنبہ بھر میں گوند، سٹورا صبح سے شام تک حصوں ہی کا تانتا لگا رہا۔ ہیجڑے بھانڈ میراثنیں، ڈومنیاں، ایک پانچ روز تک وہ طوفان رہا کہ مبارکباد کی صدائیں آسمان تک پہنچتی تھیں اور کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی، دل کھلے ہوئے حوصلے بڑھے ہوئے، اللہ آمین کی بچی، منتوں مرادوں کی اولاد جو کچھ ہوتا کم تھا خرچ والوں سے بھگت بھگتا کر گھر پہنچے

پہنچاتے، میاں کے پاس گیارہ سو پچاس روپے تھے، جو ساس کے سپرد کیے، چھٹی کا دن آیا تو کنبہ اور محلہ تو درکنار دوست اور جان پہچان تک طلب کئے گئے۔ مرد عورت ملا کر ہزار آدمی کا تخمینہ تھا۔ اور روپے صرف باقی تھے، چار سو، پانچسو اور قرض لئے۔ غرض مکان خاک میں ملا کر انعام اور بیوی کی ناک رہی، دو دن کی مہمانداری تھی، ایک دن انی جی سے گذرا، رات کا کھانا دیتے دلاتے کھاتے کھلاتے بارہ بج گئے تو ماں نے بیٹی سے کہا "ننھی اے اب تو بھی ٹکڑا کھالے، کل سے تو پھر پرہیز ہی پرہیز ہے آج چھٹی والے دن جو کھالو رنج پچ جاتا ہے" ایک غریب نے اس خیال کی مخالفت بھی کی اور کہا جناب چھٹی والے دن کیا خصوصیت ہے کہ اچھا برا، ہلکا ثقیل ٹھنڈا گرم جو کھالو سب ہضم ہو یہ بات تو قیاس میں نہیں آتی" مگر کہہ کر چور ہو گئی۔ اس سرے سے اس سرے تک سب نے یہ ہی کہا کہ "آج جو چاہے شوق سے کھاؤ" اور ذوق سے پیو" جاڑوں کے دن بیدے کی باقرخانی، ٹھنڈی برف بریانی، اروی کا سالن، اوپر سے غٹاغٹ پانی، دودھ پیتے ہی بچی کو سانس ہو گیا، پسلی کا درد اور چھ دن کی جان ایک چیخ زمین اور ایک آسمان میں تھی، حکیموں کے سردار ڈاکٹروں کے پیر جو کچھ تھے وہ پیر جی، ان میر تاج الاطبا ہی کا علاج ہوا دس پانچ تعویذ دو چار فلیتے ایک آدھ گنڈا چھ دن کی بساط ہی کیا تھی، تین چار گھنٹہ رات کو سات آٹھ گھنٹے دن کو چیخی چلائی، روئی پیٹی۔ دوپہر کے بعد بلکان ہو کر پڑی تو سمجھا کہ تسکین ہو گئی، مہمانوں کے جانے کا وقت، بیمار بچی دلہن بنائی گئی، مسالہ سے پٹے ہوئے کپڑے گوٹہ ٹھپہ ہمک کیا کہہ رہے تھے، اس کا فیصلہ تو ماجرہ کی مامتا ہی کر سکتی ہے۔ ہاں اتنا سب دیکھ رہے تھے کہ بچی تکلیف کے مارے اودی ہوئی جاتی تھی، اور گو ننھی سی جان اور بے زبان اور اس قابل نہ تھی کہ اپنی مصیبت کی کیفیت اور درد کا حال اس ظالم سے کہہ سکے جو ماں کی حیثیت میں اس کی صحت کی ذمہ دار اور محافظ تھی۔ مگر پھر بھی معصوم آنکھوں کی التجا جب وہ کھل جاتی تھیں اور پیشانی کا ننھا سا بل اپنی پوری کہانی سُنا دیتا تھا، مہمان کھاپی، انیاں خنیاں ٹھونس ٹھانس، پیر مرید گل نگلا،

چلتے ہوئے تو شام اس پھول کی موت کا پیغام ہمرے کرآئی، زندگی اور موت خدا کے ہاتھ اور تقدیر کی بات ہے۔ مگر یہ تو کھلا ہوا ستم تھا کہ دوا نام کو نہ تھی، اور تعویذوں کی بھرمار تھی! تنہائی ہوئی تو انعام نے بھی آکر بچی کو دیکھا۔ کلیجہ کا ٹکڑا تھا، اس کی تکلیف دیکھ کر بے چین ہو گیا گود میں لیا پیار کیا سینہ سے لگایا مگر وہ بیہوش پڑی تھی۔ دوڑا دوڑا پیرجی کے یہاں گیا، انھوں نے فلیتے دیئے کہ جاتے ہی دھونی دیدو اللہ چاہے اچھی ہو جائے گی، گھبرانے کی بات نہیں ہے۔" جن کو لاڈ گھسیرے ان کو دکھ بہتیرے مطمئن ہو کر گھر آیا تو ساس کی آنکھ لگ چکی تھی، اور ہاجرہ بچی کو گود میں لئے اس کی صورت پر ٹکٹکی لگائے بیٹھی تھی۔

یہ وہ وقت تھا کہ بچی دودھ چھوڑ چکی تھی، دو تین مرتبہ ماں نے جوش محبت میں رو رو کر چھاتی منہ میں دی، مگر زبان میں کام کرنے کی طاقت نہ تھی، ہاجرہ ناتجربہ کار ضرور تھی مگر اتنا اچھی طرح سمجھتی تھی کہ ایک سال سے جس کی آس لگا رکھی تھی جو چھ دن اور چھ رات میرے کلیجہ سے چمٹی اور چھاتی سے لپٹی جس پر میری تمام خوشیاں اور ارمان قربان تھے وہ آج تک میرے پاس مہمان تھی، میری خدمت ختم ہوئی، دودھ موجود ہے اور دودھ پینے والی رخصت ہوتی ہے! دفعتہً دل میں ایک ہوک اٹھی، جھکی بچی کو پیار کیا، اس کی بے بسی پر کلیجہ پھٹنے لگا۔ آنسو نکل پڑے انعام نے تسکین دی اور کہا یہ "دھونی کے فلیتے ہیں انشاء اللہ آرام ہو جائے گا پریشان نہ ہو"۔ میاں کا اتنا کہنا ایک برچھی تھی جو زخم کے پار ہو گئی آنکھ اٹھا کر اس کو دیکھا اور کہا "کیا کہہ رہے ہو، سال بھر کی محنت برباد ہو رہی ہے اور یہ ننھی سی کلی کھلنے سے پہلے مرجھاتی ہے، شفا ہو چکی آنکھیں پھر گئیں، دودھ چھٹ گیا، سانس الٹا ہے، جو ہونا تھا وہ ہو چکا، کلیجہ پر داغ لگھنا تھا کیا کروں کہاں جاؤں، اے اللہ میں اپنی بچی پر قربان ہوں مجھ پر رحم کر اس کی آئی مجھے آجائے، تنکے میں جان ڈال دے۔ اے اللہ میری بچی کو جلا دے برسوں کیسی بلک رہی تھی، مگر منہ میں دودھ لیتے ہی چپکی ہو گئی، شام سے دودھ نہیں پیا چمچہ میں نکال کر حلق میں ڈالا نہ اترا۔ میرا نصیب اس قابل کہاں کہ اب میرا دودھ یہ قبول کرے۔ ہائے کیسی سخت

تکلیف ہو رہی ہے کمزوری کے مارے آواز نہیں نکلتی دیکھو پھر پیٹ میں مروڑ اٹھا خدا کے واسطے تم گود میں لے لو مجھ سے اس کی تکلیف نہیں دیکھی جاتی اے اللہ پھولوں پر یہ اذیت"۔

انعام یوں ہی اللہ کے جی تھے۔ بیوی کی گفتگو سے کلیجہ کٹ گیا آنسو نکل پڑے۔ بچی کو گود میں لیا بیہوش تھی۔ غور سے دیکھا فرطِ محبت سے بیتاب ہو کر پیار کیا کلیجے سے چمٹایا، اور روتا رہا لپٹتا رہا۔ ہاجرہ نے آگ سلگائی، دھونی شروع کی، بچی تو پہلے ہی دم توڑ رہی تھی، دھونی کی کثرت سے سانس گھٹنے لگا، گھبرا کر ایک آنکھ کھولی گویا چھ دن کی مہمان نے چلتے ہوئے باپ سے اتنا کہہ دیا کہ دھونی کی ضرورت کیا، پیدا ہوتے ہی گلا گھونٹ دیا ہوتا۔ ہچکی لی نہ خرخرا، ایک ننھی سی سسکی تھی جس نے باپ کی گود میں بچی کو ختم کر دیا۔

ہچکی - سسکی

ساتواں باب

انعام و ہاجرہ کہنے کو ماں باپ بن گئے۔ مگر دونوں ناتجربہ کار تھے۔ اس سے پہلے مُردہ تو دیکھ لیا ہوگا مگر موت دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ دونوں نہ سمجھے کہ کیا ہوا، کیا ہو رہا ہے، اور کیا ہو گیا۔ مُردہ کلیجہ سے لگائے انعام گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بیٹھا رہا۔ بارہ بجے کے بعد وہ بھی اس طرح کہ ہاتھ نیچے لٹکا ہوا تھا چوہیا انگلی کتر گئی، اماں جان گھبرا کر اٹھیں تو اکڑی بچی کو دیکھا مُنہ سے کچھ نہ بولیں گود سے لیکر الگ لٹا دیا اور صرف اتنا کہا کہ "بس جہاں سے آئی تھیں وہیں چلی گئیں"۔ اتنا سنتے ہی دونوں نے غور سے دیکھا تو کچھ نہ تھا۔ ہاجرہ نے ایک چیخ ماری انعام نے کلیجہ پر ایک گھونسا مارا اور تینوں نے بیٹھ کر رات سے صبح کی۔ دن نکل آیا تو تجہیز و تدفین شروع ہوئی فارغ ہوئے تو شام تک رونا پیٹنا رہا مغرب سے کچھ پہلے ماں نے داماد سے کہا۔

"میاں جو ہونا تھا وہ ہو چکا صبر کرو تمہاری کمائی میں اس کا ساجھا نہ تھا کہ تمہارے پاس رہتی، چھ دن کی تکلیفیں اٹھانی تقدیر میں لکھی تھیں اٹھا گئی۔ اب تو جو کچھ اس کی محبت سمجھو یا حصہ، یہ ہے کہ اپنی حیثیت کے موافق اس کو پہنچا دو"۔

انعام: "جو فرمائیے وہ تعمیل کروں، دودھ بچوں کو پلایا جا ہی رہا ہے۔ اور مجھے معلوم

نہیں کہ کیا ہوتا ہے۔"

ساس "ارے میاں دودھ سے کیا ہوتا ہے ابھی تو پھول، دسواں، بیسواں، چالیسواں سب ہی کچھ پڑا ہے۔ بس چالیسویں تک ان بیوی کا حصہ اور سمجھ لو پھر کیا وہ گھڑی گھڑی تم سے مانگنے آئے گی۔ سینکڑوں کمانا اور کھانا دہ کہاں۔"

انعام "یہی تو عرض کر رہا ہوں پھول کب کیجئے گا، مجھے تو خبر نہیں شاید تیسرے روز ہوتے ہیں، پرسوں کر دیجئے۔"

ساس "ارے بیٹا تو آج، پرسوں بدھ ہے۔ کل ہی کے کر دو۔"

انعام "بہت اچھا جو انتظام فرمائیے وہ ہو جائے ان سے بھی صلاح لے لیجئے آخر کب تک روئیں گی؟ اللہ کی یہی مرضی تھی ہم کیا کر سکتے ہیں۔"

ساس "ان سے کیا صلاح لوں آج کیا روتی ہیں عمر بھر روئیں گی یہ داغ کہیں مٹنے والا ہے۔ ایک ناسور ہونا تھا ہو گیا۔ میاں انتظام کیا کرو گے وہی جو شادی کے آئے تھے وہی پھولوں کے ہوں گے بلکہ اور زیادہ ہی سمجھ لو کیونکہ موت کا دروازہ عام ہے۔ سب کو خبر کر دو منگل کے پھول ہیں۔"

انعام "کل تو بہت مشکل ہے کیونکہ روپیہ کا انتظام کرنا ہے جمعرات کے رکھیئے۔"

ساس "چوتھا دن ہو جائے گا۔ مگر جمعرات ہی کے سہی بلا سے وہ کہاوت تو نہ ہو گی کہ مر گئے مردود جن کی فاتحہ نہ درود۔"

انعام "جی ہاں جمعرات ہی مناسب ہے۔"

انعام سیدھا سادھا بھولا بھالا نیک شریف جو کچھ بھی تھا مگر منہ پر آنکھیں رکھتا، دیکھتا تھا دماغ میں عقل تھی واقعات پیش نظر اور معاملات آنکھ کے سامنے بچہ نہ تھا، سودائی نہ تھا جان سکتا تھا کہ یہ چال چلنے والی اور یہ حال رہنے والا نہیں۔ جائداد کب تک ساتھ دے گی، اور زیور کہاں تک ہاتھ بٹائے گا۔ تھوڑے روز بعد سب صفایا ہے۔ بیوی

ہاتھ ہبکرانہ پاؤں پبکڑا اور میاں لنڈورے چڑے رہ جائیں گے۔ خود ہماری عقل کام نہیں کرتی کہ یہ بھبید کیا تھا ایسی کٹر مسلمان کہ بھبولیوں کا کھانا گھر میں گھسنے تک نہ دے، باپ ایسا جیدّ عالم کہ شبرات کا حلوا اور محرّم کا شربت بدعت سمجھے اور اولاد کی عقل پر یہ پتھر پڑے کہ چھ دن کی پھونسٹر لڑکی اور بھبولیوں کا اہتمام' یہ کال پڑا ہوا، حال بگڑے ہوئے' پان سیر کا آٹا، آدھ سیر کا گھی اچھے اچھے رئیسوں کے چھکّے چھوٹے جاتے تھے۔ انعام کی تو ہستی کیا تھی، گرہ میں نہیں کوڑی گٹّے والے ہوت! ایک ہفتہ میں دو تقریبیں، شادی بھی اور غمی بھی عقیقہ بھی اور بھبول بھی، پوری برادری اور بڑا خاندان' دو دستر خوان کیا ہنسی کھیل تھے۔ مگر رسوم کا چکّر ایسا تھا کہ جو ہو وہ دھوم سے۔ اصل چیز روپیہ تھا۔ لاتے کہاں سے اور دیتا کون؟ وہی لے دے کر ایک بلّا باقی اللہ اکبر صلاؔ مگر بلا کیا ایسے بھولے تھے۔ صاف جواب دے دیا اور کہہ دیا، جناب آپ کا مکان بارہ ہزار کا ہے تو ہمیں ہزار کا ہے تو۔ اللہ آپ کو نصیب کرے۔ آپ بیچ تو رہے ہی ہیں جتنا لینا اتنا دینا۔ مگر اس کی نگاہ میں مال زیادہ کا نہیں' وہ تو اس وقت بھی اکڑ رہا تھا کہ رقم زیادہ ہے، خبر نہیں میں نے کس کس طرح جمایا ہے۔ پٹیالے والی دوکان کے قبالے لے آئیے اللہ چاہے کام ہو جائے گا۔ انعام کو کچے گھڑے کی چڑھی ہوئی تھی، فکر کرتی اس کی جوتی' اور غور کرتا اس کا صدقہ۔ سیدھا اُٹھ گھر آیا قفل کھول کاغذ نکالے اور چپکا وہاں پہنچا، پٹیالے والی جائداد شہر کا مول یا انگوٹھی کا نگینہ تھا، بدنصیب نے کوڑیوں کے مول بہا دی' اور پندرہ سو روپیہ گود میں ڈال اور جیب میں بھر گھر آئے تو بلاوے پھر ہی چکے تھے، کھانے دانے کا انتظام شروع ہو گیا۔ کہتے ہیں آدمی کچھ کھو کر سیکھتا ہے۔ صبح کا بھولا شام کو بھی گھر آجائے تو غنیمت ہے۔ پیر جی کے کرتوت آنکھوں سے دیکھے، دن دہاڑے دیکھے، کھلے خزانے دیکھے، ایک دیکھا دو دیکھے صادقہ کو آگے دے کر اس نے مروایا، بچی کو دھونی دے کر اس نے ختم کیا۔ بکروں کے نام سے اُس نے مزے اُڑائے، مرغوں کے بہانے اس نے چھین کیا، تعویذوں کی آڑ میں اُس نے

پیٹ بھرا، علاج کی دھونس میں اس نے گلچھرے اڑے۔ مگر کیا مجال جواب بھی اس کے وقار میں فرق آیا عظمت میں کمی آجاتی، کھانا پکا تو دو دیگیں بند کی بند اس کے پاس بھیجدی گئیں۔ مفت کا مال قاضی کو بھی حلال، دن بھر وہ لُٹس مچی کہ تیرہ من بریانی میں شام کو دانہ تک نہ بچا۔ خدا معلوم بٹیا بے کی جائداد نے، بلّا نے یا خدا نے، کس نے اس وقت تو میاں انعام کی عزت رکھ لی اور آنکھ بند کر کے آٹھ دن گذر گئے تو دسواں آیا، باپ، دادا کی نشانی تھی یا گھر کا کوڑا، گھوڑا تو کبھی کا مر چکا تھا۔ گاڑی البتہ موجود تھی، وہ اس کی نذر ہوئی۔ دنوں کو جاتے کیا دیر لگتی ہے، دسواں ختم ہوتے ہی بیسویں نے سلام علیک کی صدا دی۔ اس وقت ساس کی، اور بیوی کی عنایت دونوں شکریہ کے قابل تھیں، ماں بیٹیوں کی صلاح جو کچھ ہوئی ہو۔ لیکن دوپہر کے وقت ایک روز اِدھر انعام کھانا کھا کر اٹھا اُدھر اماں جان نے کہا "بیٹا بیسویں کا کھڑاک زیادہ نہ کرنا۔ مہمانداری کی ضرورت نہیں معمولی کھانا پکوا کر اللہ کے نام دے دو ایسا ہی ہے تو گودبیٹ میں حصّے بھیجدینا۔ نہ ہو تو اولاد کے لئے چوری بختوڑی کی جائے گی۔ جو کچھ کرنا ہے سو روپے کے اندر اندر کر لو۔ یہ کنگن لیجاؤ اس پر روپے لے آؤ۔ بھائی زیور تو رجھے کا سنگار اور بچھے کا اُتار ہے، چالیسویں سے فارغ ہو کر سارے قرضہ کی قسط لگا دینا۔ بریانی متنجن ہی کا کیا ٹھیکہ ہے۔ روٹی سالن اور قبولی کر دو، پانچ من کی روٹی اور دو من کی فیرنی بہت ہے"

ساس کی اوّل تو شفقت آمیز گفتگو اس پر بچت بسا غنیمت تھی بہت خوش بے حد شکر گزار اور حد سے زیادہ ممنون ہوئے۔ روپیہ کنگن پر لائے اور بیسویں سے فراغت پائی تو چہلم دندناکر آرہا تھا، اور آگیا رہا تھا باتوں ہی باتوں میں آبھی پہنچا، تو انعام نے اپنی طرف سے پہل کی اور ساس سے پوچھا "اماں جان چالیسویں میں چار دن رہ گئے۔ اب جس طرح فرمایئے روپیہ کا انتظام کیا جائے"۔

ساس "کیا بتاؤں میرے تو آپ ہوش اُڑے جاتے ہیں، رات کی نیند ہے نہ دن کی بھوک، اسی چکر میں ہوں، بیسویں کے بعد مہینہ کی فاتحہ تھی تم کو خبر بھی نہیں کی جو اللہ نے دیا

کردیا - اب یہ چالیسواں تو آخری دان ہے - زندہ رہی جہیز لینی تم اپنی حیثیت دیکھ لو آنے والے تو دہی میں جو چھٹی میں تھے، اب ڈولیوں کا کرایہ بھی ہے - پھولوں میں نہیں تھا"

انعام:- "بس تو کوئی دو ہزار کا تخمینہ ہے"

ساس:- "ہاں اور کیا"

مرے کو مارے شاہ مدار چالیسویں میں ابھی چار روز باقی تھے کہ شبرات نے بھی وار کر دیا - زندوں کے کھانے تیس دن مردوں کی ایک شبرات، پوریاں پکنی لازمی اور حلوہ ضروری - شبرات اور وہ بھی چالیسویں کی کہ ابھی مردے کی روح گھر ہی میں ہے، مردہ اور وہ بھی اتنا عظیم الشان، اتنا موٹا، اتنا تازہ، اتنا لمبا چوڑا کہ اکٹھے چھ دن اور چھ رات دنیا میں رہا! جس کے صرف مرض ہی کارہائے نمایاں سمجھے جائیں تو بہت کچھ ہیں - ایسے مردہ کو تو حلوا کیا اور زردہ کیا جو کچھ بھی پکتا کم تھا - جائداد دے کر صدر کی کچھ باقی رہ گئی تھی، اس بہانے وہ بھی گروی بیٹھی اور روپیہ آیا تو بات پیچھے شبرات پہلے! اس پر طرہ بیوی سب گنوں پوری رسموں کی شیدا، تہواروں کی عاشق، یقین کی پختہ "ارادوں کی پکی" - برس کا برس دن فقط حلوے سے کیا کام چلتا، دنیا جہان کے مردے آتش بازی چھوٹتے اور رہا جرہ کی بچی ایک ایک کا منہ تکتی! غرض شبرات زور شور سے منائی گئی -

آٹھواں باب

تقدیر کی خوبی تھی اور وقت کی بات کہ انعام کا پھوپی زاد بھائی تھا تو بچہ مگر نہایت سمجھدار اور رذمانبرداری دیوبند میں عربی پڑھتا تھا، ہفتہ بھر کے واسطے گھر آیا - بیوہ ماں مرتے وقت بھتیجے یعنی انعام کے ہاتھ میں ہاتھ اور پندرہ سو روپے دے گئی ۲ انعام بات کی لاج یا ہاتھ پکڑے کی شرم کیا خاک رکھتے، غرض اپنے شوق سے پڑھتا پھرتا دیوبند جا پہنچا، فطرت میں علم، طبیعت میں ذوق، ذہن کا اچھا، عادت کا مسکین تھوڑے ہی روز میں وظیفہ مل گیا، تین سال بعد گھر آیا تو کنبہ برادری، خاندان، جان پہچان، غیر خویش جو کچھ تھے وہ

میاں انعام عزیز تھے۔ بزرگ تھے امین تھے، قریبی تھے جو کچھ تھے حضرت تھے بھائی، بھائی سے زیادہ بھاوج، بھاوج سے بڑھ کر بھاوج کی ماں، دو چار دن تو خوب آؤ بھگت ہوئی۔ مگر حرف مطلب زبان پر آنا تھا کہ سب دیدے بدل گئے۔ مفلس تھا، غریب تھا، بے بس تھا، بیکس تھا تین برس کی جان یتیم ہوا، دو سال بعد ماں کا بچھوڑا، ایک خدا کا سہارا تھا ورنہ کوئی آنکھ اٹھا کر بھی دیکھنے والا نہ تھا۔ سات برس کی عمر تک انعام کے ہاں رہا بساط ہی کیا تھی، مگر دیکھ رہا تھا، مٹی پلید اور زندگی برباد ہو رہی ہے۔ دیس چوری پردیس بھیک وطن کو خیرباد کہا اور نکل کھڑا ہوا۔ خدا مسبب الاسباب تھا، غیب سے سامان ہوا دارالعلوم دیوبند نے لاوارث یتیم کو آغوشِ شفقت میں لیا۔ اللہ والوں نے معصوم کے دل سے ماں باپ کی یاد بھلا دی عمر کے ساتھ شوقِ علم، اور شوق کے ساتھ ضروریات، تعلیم نے ترقی کی، کتابوں کی ضرورت تھی، بچپن کی سُنی سنائی امانت خیال میں، ادھر کا قصد کیا شرافت کا اہتمام، چالیسویں کا سر انجام بچوں کا کھیل روپیہ کی ریل پیل، بھائی بھاوج کا حوصلہ دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں، کامیابی کا یقین پورا تھا مگر بھائی کی لیت و لال بھاوج کی ٹال مٹول معصوم کو ایک ایک دن ایک ایک سال تھا۔ منت سے کہا، خوشامد سے کہا، ہاتھ جوڑ کر کہا۔ مگر یہاں تو ان تلوں تیل ہی نہ تھا گویا دو چار دن تو اِس کان سُنا اور اُس کان اُڑا دیا۔ مگر جب یہ دیکھا کہ یہ بلا ٹلنے والی نہیں، بیٹھے بٹھلائے مفت کی ہتیا آئی تو صاف کہدیا کہ "بھائی کس کا روپیہ کیسی امانت اتنے دنوں تک پالا پوسا، کھلایا پلایا، اس کا بدلہ یہ کہ اتنا بڑا طوفان عظیم بہتان، دوند چراکھٹے ڈیڑھ ہزار، خدا کو دیکھا نہیں عقل سے پہچانا، بچے ہو بات بھی کہی تو کچی، ہم ایسا تو رکھو کہ لپ جائے۔ اس میں تو اُلٹے دیوانے بنو گے۔ آپا دلدادی بیچاری نے ڈیڑھ ہزار تو درکنار کبھی ڈیڑھ سو آنکھ کھول کر نہ دیکھے ہوں گے۔ کفن تک تو نصیب ہوا نہیں گور گڑھا ہم نے کیا، چھوٹے چچا کا دم تھا جو پھول بھی ہو گئے، تمہارے ابا عمر بھر بھیک مانگتے رہے۔ دوسروں کی کمائی پر ان کا گذران تھا۔ ہمیشہ خیرات کے کپڑے پہنے اور جمعرات کی روٹیاں

کھائیں، بیکار رہے، قرضدار مرے، مٹی کے برتن، بیری کپڑے، پھٹا ہوا ٹاٹ، جنم نہ دیکھا بوریا، سپنے میں آئی کھاٹ! دونوں میاں بیوی دس روپوں کے واسطے مرتے مر گئے اور منجھلے ماموں جان نے نہ دیئے۔ یوں تم میرے بھائی ہو اللہ کے نام کا سودا ہے دو چار روپے سے باہر نہیں ہوں مگر تم عمر بھر کی جھپٹم جھپٹا کر رہے ہو، خود سوچو یہ رشتہ توڑنے کی باتیں ہیں یا جوڑنے کی۔ یہ الزام تھوڑا ہے، میں تو انشاء اللہ عمر بھر تمہاری صورت نہ دیکھوں گا، کٹر اسا چھوڑ کر ماں مری، مکھیاں بھنک رہی تھیں، کلیجہ سے لگا کر رکھا چھوٹے سے بڑا کیا۔ آپ دکھ اٹھا کر تمہیں سکھ دیا۔ اس کا نتیجہ یہ مل رہا ہے! واہ حضرت واہ جس نے تم کو یہ ترکیب بتائی وہ تمہارا خیر خواہ نہیں دشمن ہے۔ جیتی جان کے ساتھ دکھ بیماری، مرنا جینا، اچھی بری بیس جھگڑے ہیں، عزیزوں میں، بزرگوں میں، چھوٹوں میں، اب تمہارا رہا کون سارے کنبہ میں ایک پھوپا کا دم ہے دے کر جو ہوں سو میں، مجھ کو بھی تم نے ہاتھ سے کھویا۔ اب میری طرف سے مرو یا جیو۔ اللہ چاہے بات تک نہ کروں تم مجھ سے گئے ہیں تم سے، شریف ہو تو میرے مردے تک پر نہ آنا یہ تمہاری بھابی مسلمان بیٹھی ہیں بیوی ہیں تو ہوں میری قبر میں تھوڑی سوئیں گی۔ ان کے ہاتھ پر قرآن رکھدو، اماں جان موجود ہیں، ان سے پوچھو کبھی بھی کسی نے سنا، مرنے والی اچانک تو مری نہیں کہ کلیا ہیں گئے، پھوٹ گیا ڈیڑھ مہینے کھٹیا کٹی تھی۔ آئے تے، گئے سے، اپنے سے غیر سے کسی سے تو ذکر کیا ہوگا۔ ایک ہی گواہ لے آؤ۔ ڈیڑھ ہزار کیا میں تو دو ہزار دینے کو تیار ہوں، مرنا ہے سدا یہاں رہنا نہیں کہ تم غریب کی امانت ہضم کر لوں۔ آخر یہ تم سے کہا کس نے میں بھی تو سنوں یہ عنایت ہے کس کی؟"

امید کیسی پورا یقین تھا کہ روپیہ ترکی کے بھول سے گنوالوں گا۔ مگر کورا جواب سن کر سناٹا آگیا۔ کہتا کس سے اور کرتا کیا۔ بمشکل تمام کرایہ کا انتظام کیا تھا تو یہاں تک پہنچ بھی گیا، اب واپسی کے بھی لالے تھے، آنکھوں میں آنسو آ گئے کہ حسرت سے ظالم

کی صورت دیکھی خاموش ہوگیا تو بھاوج نے کہا:۔

"بھائی تو دیوانہ ہوا ہے ؟ چڑھیں صدی۔ کرونگی ہو درے بدی، پانچ برس تک مفت کی روٹیاں توڑیں، اور اچھے سے اچھا کپڑا پہنا۔ وہ احسان تو گیا چولھے میں، اللہ بے ایمان بنا دیا، تمہاری میا کو ڈھنگ کی روٹی تو کبھی جڑی نہیں، آپ لُنڈی، میاں اپاہج، کرایہ کی دو روپلیاں تو کبھی نکلنی نصیب ہوئی نہیں، پونے تین برس کا کرایہ حافظ جی کا مارا، سوا دو برس چچا نصیر کی ڈیوڑھی میں پڑیں، ڈیڑھ ہزار کا نام بھی سُن لیا؟ کبھی دیکھے بھی ہیں؟ بیٹا ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھاؤ، اب ادھر کا رخ نہ کرنا، دیوانے ہو تو سڑک پر جا کر لوگوں کے پتھر مارو کہ پکڑے جاؤ یہاں بیٹھ کر کیوں دوسروں کی جان جلائی؟"

انعام "میاں اٹھو دیکھو ادھر ہے دروازہ، سنبھالو اپنا اسباب وسباب لو ایک تو یہ تمھارا پھٹا ہوا بستہ ہے جس کو بیگ فرماتے ہو، دو یہ کتابیں ہیں دیکھ لو خبر نہیں کیا کہدو، کہ بیگ میں اشرفیاں بھری تھیں"۔

لڑکا "بہت اچھا ابھی چلا جاتا ہوں"۔

انعام "چلا جاتا نہیں، بس کھڑے ہو جاؤ"۔

نواں باب

روپیہ کی مایوسی کا زیادہ اثر نہ تھا البتہ توقعات کے خاتمہ نے معصوم کے دل پر بجلی گرا دی، کتابوں کی خوشی، ایک خواہش کی تکمیل، ایک ارمان کا پورا ہونا، فرحت وانبساط کا ایک دریا تھا جس نے یتیم کے دل میں دنوں لہریں لیں اور راتوں سبز باغ دکھائے مگر اس وقت وہ دریا چٹیل بیابان اور سبزی اجاڑ میدان تھا۔ پھٹا تھیلا بغل میں لیا اور سلام علیک کر کے باہر آگیا۔

باوجود اس سنگین جرم کے جو اعلیٰ الاعلان تھا ہم انعام کو بے ایمان کہنے پر تیار نہیں اس نے جو کچھ کیا مجبوری سے اور جو کہا لاچاری سے، چور کے پاؤں کہاں وہ

صورت دیکھتے ہی کھٹک گیا تھا۔ میاں بیوی کی صلاح ہو گئی اور میاں نے جو کچھ کہا وہ درحقیقت انعام کی زبان اور ہاجرہ کا بیان تھا۔ اس راز کے واقف اوّل تو تھے ہی نہیں اور جو دو چار تھے بھی وہ مر کھپ گئے۔ ایک مولانا حق داد باقی رہ گئے تھے۔ بیچارے اگلے زمانے کے آدمی پُرانی آنکھیں دیکھے ہوئے، انعام کے حالات سُن سن کر سانپ کی طرح سر دھنتے اور چپ ہو جاتے، بڈھے آدمی تھے۔ بارہ مہینے کے نمازی، تہجد گزار، ایک کونہ میں رہنا اور اللہ اللہ کرنا، نہ معلوم کس ضرورت سے لکڑی ٹیکتے، تسبیح پڑھتے ہوئے چلے جاتے تھے کہ لڑکے نے سلام علیک کی ٹھٹک گئے جواب دیا، بصارت کمزور تھی پہچان نہ سکے پوچھا "میاں کیا نام ہے؟"

لڑکا: "غلام کو حسن امام کہتے ہیں۔"

مولانا: "کس کے صاحبزادے ہو؟"

لڑکا: "والد صاحب کا نام مولوی عبدالماجد۔"

مولانا: "دلداری کے لختِ جگر ہو؟"

لڑکا: "جی ہاں۔"

مولانا: "بیٹا میرے پاس آؤ گلے سے لگو، تم کہاں ہو، کب آئے کہاں ٹھہرے ہو۔ میاں انعام کے ہاں؟"

لڑکا: "ہفتہ بھر کے قریب ہوا وہیں ٹھہرا اب جا رہا ہوں۔"

مولانا: "میاں ایسی جلدی کیوں جاتے ہو، دو ایک روز میرے ہاں رہو۔"

لڑکا: "کچھ روپیہ بھائی کے پاس تھا وہ لینے آیا تھا، کتابوں کی ضرورت تھی۔"

مولانا: "ہاں ہاں، لے لیا؟"

لڑکا: "جی نہیں اُنھوں نے فرمایا ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔"

مولانا: "کیا! وہ تو اُن کے پاس امانت ہے، چلو تم میرے ہاں چلو میں تم سے

بات کر دں" دل ٹوٹا ہوا ہمت چھوٹی ہوئی بےچینی اور بےکسی دونوں حالتیں قابل رحم تھیں، مولانا کا چمکارنا تھا کہ معصوم کا دِل بھر آیا لپٹ گیا اور رونے لگا۔ مولانا قریبی عزیز تھے اس کی صورت دیکھتے ہی دلداری کی تصویر آنکھ کے سامنے پھر گئی اور وہ وقت یاد آگیا کہ مرنے والی کی رُوح عالم بالا کو پرواز کر رہی تھی معصوم بچّہ کلیجہ سے چمٹا ہوا تھا اور مفارقت ابدی کے خیال سے کلیجہ مُنہ کو آرہا تھا انعام کو بلا کر روپیہ سپرد کیا اور کہا "یہ یتیم کی امانت ہے حقیقی وارث اور بہتر امین آپ ہیں بن باپ کا بچّہ جواب بِن ما کا ہوتا ہے" آپ کے سپرد ہے، اس کی تربیت میں جو کچھ صرف ہو وہ کیجیے گا اور باقی اس کی تعلیم و تربیت اور شادی بیاہ کے واسطے ہے۔ یہ بے وارثی کی التجا اور بیوہ کی درخواست ہے آپ جس قدر اس بچّہ پر رحم کریں گے اسی قدر میری روح آپ کے واسطے دُعا کرے گی میرے پاس اس کا معاوضہ کچھ نہیں، نہ میں اس کے قابل ہوں۔ ہاں مالک حقیقی آپ کو دونوں جہان میں اس کی جزا دے گا"

مولانا کی آنکھ سے وہ سماں یاد آتے ہی آنسو نکل پڑے، گھر لائے، ہاتھ مُنہ دُھلا کر اپنے ساتھ کھانا کھلایا۔ رات زیادہ آگئی تھی، جب تک بچّہ جاگتا رہا سمجھاتے رہے اس کی تعلیم کا حال سُنکر بے انتہا خوش ہوئے اور علی الصباح دونوں نماز سے فارغ ہو کر انعام کے پاس آئے۔

مولانا بڈھے پھونس اسّی برس کی عمر کمر جھکی ہوئی ہاتھ پاؤں میں رعشہ بسم اللہ کہہ کر جو اندر داخل ہوئے تو انعام کا خون خشک ہو گیا۔ بس نہیں چلتا کہ بچّہ کو کچّا کھا جاتا۔ خواستہ یا ناخواستہ رضا بہ قضا اندر لے کر آیا اور دو زانو سامنے بیٹھ گیا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر کے مولانا نے کہا "انعام میاں آج میں نے تین بلکہ ساڑھے تین برس بعد تمہاری صورت دیکھی ہے۔ بڑے مولوی صاحب اللہ بخشے عمر میں مجھ سے چھوٹے تھے۔ مگر چالیس برس میں ایک دن بھی ایسا نہ گذرا کہ وہ مجھ سے نہ ملے ہوں۔ اوّل تو میں

خود ہی آندھی ہو یا مینہ ناغہ نہ کرتا تھا اور کبھی دکھ بیماری کی وجہ سے ایسا مجبور ہو گیا تو آدھی رات تک دروازہ کھولے بیٹھے رہتے تھے۔ ناامید ہوئے سیدھے اُٹھے اور پہنچے۔ اب میں اس قابل ہی نہ رہا۔ ہاتھ پاؤں جواب دے چکے، بدن میں طاقت نہیں ہاتھ پاؤں میں سکت نہیں دو قدم چلتا ہوں سانس پھول جاتا ہے! آنکھیں ہی نہ رہیں، تم سامنے بیٹھے ہو مگر صورت صاف نظر نہیں آتی، پر محلے پڑا ہوں، مگر تمھارے حالات رتی رتی اور تل تل میرے کان تک پہنچ رہے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ تمھاری عقل پر کیا پتھر پڑ گئے۔ بیہ قوف بھی دیکھے، عقلمند بھی، غریب بھی دیکھے، امیر بھی، بچے بھی، بڈھے بھی، مگر تم نے تو وہ تم ڈھایا ہے کہ دیکھا نہ سُنا! بزرگوں کی ناک تم نے کاٹی، ابا باوا کی آبرو تم نے برباد کی۔ باپ دادا کی لاج تم نے گنوائی۔ خاندان برپانی تم نے پھیرا جس گھر پر کوئی بھول کر بھی خدا کے سوا دوسرا نام نہ لیتا تھا۔ اس در پر آج تمہارے راج میں رمّوں کی حکومت اور فقیروں کا ڈنکا بج رہا ہے۔ خدا کی شان ہے، جہاں دن رات قال اللہ قال الرسول کے چرچے رہتے تھے، وہاں آج کوئی بھول کر بھی خدا کا نام نہ لے! میں نے تمہارا بچپن دیکھا، لڑکپن دیکھا اور آج باپ ہونے کے بعد بھی تمہاری صورت میرے روبرو ہے مگر یہ تغیر یہ فرق یہ انقلاب جو صورت میں نہیں سیرت میں، وجاہت میں نہیں حالت میں، نام میں نہیں کام میں۔ حالات میں عادات میں، اطوار میں، رفتار میں، سُن رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں، سُن سُن کر اور دیکھ دیکھ کر روح فنا ہوئی جاتی ہے۔ تم لاکھ بچے تھے، مگر مولانا ئے مرحوم سے میرے دن رات کے تعلقات ہر وقت کا ملنا جلنا تم کو یاد نہ ہوگا! میں اس شمع ہدایت کا پروانہ اور نہ وہ مغفور میرے اس قدر نہ قدردان تھے کہ حقیقی بھائی قربان! تم ان کی یادگار تھے، سر بدے کا سر، میرے زخم پر مرہم رکھتے، شریک تدفین تھے، باعثِ تسکین ہوتے۔ مگر تم نے تو وہ سلسلہ منقطع، وہ تعلقات ختم، اور وہ محبت ہی خاک میں ملا دی لیکن بیٹا میں تمہارا جیسا دل کہاں سے لاؤں۔

سنتا ہوں اور کڑھتا ہوں۔ جلتا ہوں اور روتا ہوں۔ کیا کروں مجبور ہوں لاچار ہوں، بے پر ہوں۔ بے بس ہوں۔ عمر بھر کی کمائی اور اسّی برس کا سرمایہ دو بچے نصیر اور بی عبادی ہیں، مگر یقین کرنا ان دونوں کی بربادی اور تباہی کا مجھکو اتنا صدمہ نہ ہوتا جتنا تمہارا۔ قبر میں پاؤں ہیں، مرنے کو تیار ہوں مگر سچ کہتا ہوں کہ کوئی رات خالی کوئی دن صاف اور کوئی نماز ایسی نہیں جاتی کہ تمھارے واسطے دعا نہ کرتا ہوں۔ میں جانتا ہوں اور تم سے زیادہ جانتا ہوں کہ بیوی ہمیشہ کی رفیق اور عمر بھر کی ساتھی ہے پرائی جائی اسی دن کو لائی جاتی ہے کہ میاں بیوی سلوک سے رہیں اور عزت سے زندگی بسر کریں مگر ایک تم ہی انوکھی بیوی نہیں لائے، دُنیا لاتی ہے اور رکھتی ہے مگر یہ شرک یہ بُت پرستی الامان الحفیظ کہ پیروں کو رسولؐ سے اور فقیروں کو خدا سے بڑھاؤ!! شرم کا مقام اور رونے کا وقت ہے کہ بڑے بڑے عالم اور اچھے اچھے زاہد تمہارے والد مرحوم سے مصافحہ کے خواستگار ہوں اور تم ایک بنے ہوئے پیر اور چھوٹے فقیر کے آگے ناک رگڑو، یہ تمہاری بیوی جو آج گھر والی بنی بیٹھی ہے، میرے سامنے کی بچہ اور گودوں کی کھلائی ہیں، سُن رہی ہیں اور سمجھ رہی ہیں، بولیں اور بتائیں، بہوئیں اسی دن کو آتی ہیں کہ ساس سسروں کی ناک جڑ سے کاٹ دیں؟ بہو اسی لئے ہزار برس کی بہو کہلاتی ہے کہ بزرگوں کی آن بان پر آنکھ بند کر کے پانی پھیر دے؟ دونوں میاں بیوی مسلمان ہو اور مسلمان کہلاتے ہو مگر کافر تم سے اچھے اور مشرک تم سے بہتر، سوچو غور کرو اسلام کا اصلی منشا شرک کو مٹانا اور بت پرستی کو غارت کرنا تھا، یہاں تک کہ خود رسول اکرمؐ کو یہ کہنا پڑا کہ میں بھی تم ہی جیسا انسان ہوں خدا خدا ہی ہے۔

مجھے حق نے دی ہے بس اتنی بزرگی
کہ بندہ ہوں میں اس کا اور ایلچی بھی

ایسا سچا مذہب، ایسا اچھا رسولؐ جس نے صاف صاف کہدا کہ سوا ایک ذاتِ واحد کے کوئی دوسرا عبادت کے قابل نہ پرستش کے لائق، تم اس کے پیرو ہو کر اپنے

ہی جیسے انسانوں کو خدا سمجھو، رسول جانو! سدا یہیں رہنا نہیں چلنا بھی ہے۔ یہ عارضی جلوے، یہ فانی ضرور تیں سب ختم ہونے والی ہیں۔ ہاں ان کی یادگار وہ کلنک کے ٹیکے جو تمہارے ماتھے پر چمک رہے ہیں۔ تمہارے اعمال ناموں سے مٹنے والے نہیں، نہ یہ سیاہ دھبّے چھوٹنے والے نہ یہ شرک کی زنجیریں ٹوٹنے والی، یہ ذلیل افعال اور کمینہ اعمال اوپر ہی اوپر نہ جائیں گے، ان کا جواب لازمی، ان کا حساب ضروری، اُن کا عذاب اٹل۔ آنکھیں بند کرو اور دیکھو، قبر کی ہولناک منزل، موت کا خطرناک سماں، قیامت کا وحشت ناک میدان نظر آجائے گا، موت پاس، اور نتیجہ ظاہر قدرت والا مالک بازپرس کو تیار اور ایک بندۂ گنہگار مشرک و نابکار سرنگوں۔ ھاجرہ! قیامت خیز وقت ہوگا اس حاکم کا سامنا جہاں پیر اور فقیر، ولی اور پیمبر سب بے بس ہوں گے۔ اس عذاب سے جو سخت ہے، اس آگ سے جو تیز ہے، اس غصہ سے جو آگ ہے۔ بچ۔ توبہ کر! پناہ مانگ!

مُسلمانوں پر تباہی کیوں آئی؟ اس تناور درخت کی طرح جس کو دیمک اندر ہی اندر غارت کرتی ہے، رسوم کی پابندی نے ان کو کھوکھلا کر دیا۔ جائدادیں اس کی بھینٹ چڑھیں تعلقے اس کی نظر ہوئے، رئیسوں کو بھیک اس نے منگوائی، امیروں کو فقیر اس نے بنایا، نوکروں پر حکومت کرنے والے محض اس کے طفیل آج چلمیں بھر رہے ہیں، اور محلوں کی بیٹھنے والیاں اس کی بدولت جوتیاں چٹخاتی پھرتی ہیں، بڑے بڑے خاندان اچھے اچھے گھرانے، امیروں کے بچے، وزیروں کی اولاد، اسی کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوئی۔ غضب خدا کا آدھ گز کی بچی چھ دن کی جان اور رسموں کی یہ شان کہ کنبہ بھر کا بلاوا، اور آدھا شہر مہمان۔ ایک دو نہیں بیسیوں اور سیکڑوں عقیقے کئے بھی اور دیکھے بھی، سُنے بھی اور سُنائے بھی، مگر دیکھا نہ سُنا، اور خدا دکھائے نہ سنائے کہ لڑکی کا عقیقہ اور شادی کی یہ دھوم دھام کہ صبح اور شام دونوں وقت اذنِ عام ہے۔ مُفت کی

دولت ہاتھ لگی، جتنے لالے تللے کر و تھوڑے، جس وقت اور آفت سے پریشانی در مصیبت سے
یہ جائداد جو تم نے اُف کردی مرنے والی نے بچائی اور چھوڑی۔ وہ میرا دل جانتا ہے۔ اللہ
اللہ کیسی شان کے لوگ تھے۔ تکلیفوں کو راحت اور روکھی روٹی کو امرت سمجھا، مگر قرض خواہ
کو دروازے پر نہ آنے دیا۔ یہ پھوٹی ہوئی آنکھیں وہ سماں دیکھ چکی ہیں کہ پھول سے بچے اور
معصوم مولوی زادیاں فاقہ سے پڑیں اور چودہ گھنٹہ کی رات صاف گذر گئی لیکن مکان
پر آنچ نہ آنے دی۔ رحمان جوڑے پلی پلی، شیطان لنڈھائے گیا، تم نے باپ کی نصیحت
اور ماں کی وصیت خوب نباہی! الغرض یہ زندگی ختم ہونے والی اور یہ وقت گذرنے والا،
یہ باتیں فنا ہونے والی، یہ دن ڈوبنے والے اور یہ راتیں سحر ہونے والی ہیں، اور درپیش
ہے وہ سفر جس کی منزل کڑی جس کا راستہ کٹھن، جس کی راتیں لمبی جس کے دن پہاڑ،
جس کی شام طویل، جس کا مقام دُور، ڈرو اور اس سے پہلے کہ کسی قابل نہ رہو، کر لو جو کر سکتے
ہو اور کما لو جو کمانا ہے، یہ رسموں کے بندھن، یہ بربادی منجن، بربادی کے لچھن، یہ عقیقے اور
چالیسویں یہ چھٹی اور چلے وہ دیمک اور کلے ہیں۔ جنہوں نے عظیم الشان محل سرائیں، اور یہ
بڑی بڑی عمارتیں چشم زدن میں ڈھادیں۔ دیکھنے دکھانے کے لائق لوگ جن پر کنبہ فخر
اور برادری ناز کرتی تھی، ان رسموں کے ہاتھوں دو دو دانوں کو محتاج ہو گئے۔
گلشن اسلام ان سے آبیاری کا متوقع اور ان کے دست کرم کا منتظر رہا۔ اور وہ
آنکھوں کے اندھے ان پھندوں میں ایسے پھنسے کہ جب چلے تو مرتے وقت کوئی حلق
میں پانی تک ٹپکانے والا میسر نہ ہوا۔ شریفوں کے بچے الف، بے سے آگے نہ بڑھے۔
اور امیروں کی بچیاں قلم دوات کے نام کو ترسیں۔ جہاں دولت کے انبار لگے رہتے تھے
وہاں تعلیم کے اخراجات بار ہو گئے اور جہاں اقبال دست بستہ حاضر تھا وہاں کتابوں
کے دام وبال۔ آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ ڈپٹی نصیر الدین کا حقیقی پوتا، جہاں باندھی
بندھتی اور چھوٹی چھٹتی تھی جس نے بیٹے کے بیاہ پر دیگوں کے منہ کھول دیئے، آج

کلّو کے تکیہ میں قبریں کھود کر پیٹ بھر رہا ہے۔ کان سن رہے ہیں کہ منّو تیلی کا نواسہ جس نے
بیٹی کی چھیٹی میں سونے چاندی کی کھچڑی دی مکھیاں بھنکتا ہوا پیسے کے شہد کو تڑپتا مر گیا!
مگر واہ رے حمیّت و غیرت! اب بھی اثر نہیں ہوتا۔ یہ جائداد تمہاری ملکیت ضرور تھی، مگر
امانت تھی جن آنکھوں سے لی تھی اُن ہی آنکھوں سے لوٹا دیتے، مرنے والے تمہارے
لئے چھوڑ گئے تم اپنی اولاد کے لئے چھوڑ جاتے۔ زندگی تک کسی کے محتاج اور دست نگر نہ ہوتے
اور زندگی کے بعد اس طرح جاتے کہ اولاد دوسروں کا منہ نہ تکتی، مگر کھو چکے جو کھونا تھا
اور گنوا چکے جو گنوانا تھا۔ پیر جی سے گریز، مزاروں سے پرہیز کا وقت ابھی باقی ہے
ایک توبہ میں بیڑا پار لیکن ساری جائداد کیا اگر ایسی ایسی چار زندگیاں بھی ملجائیں تو اب
ہزار روپیہ بھی جمع نہیں کر سکتے۔ تم نے بچوں کی حق تلفی کی قوم کے حق مارے، حق داروں
پر ظلم کیا، غریبوں پر ستم کیا ماشاء اللہ جوان ہو دنیا میں رہنا ہے، باپ بننا، دادا نانا ہونا،
بتاؤ کیا زندگی ہوگی؟ جیو گے لیکن ذلیل۔ رہو گے مگر فقیر۔ عزت تم سے ہزاروں کوس
دُور رہے گی اور بھرم تم سے لاکھوں میل پرے (وقعت جو اس گھر کی چیری اور اس
خاندان کی باندی تھی آ کر بھی نہ پھٹکے گی۔ اعتماد جس پر انسانی زندگی کا انحصار ہے بھول
کر بھی نہ جھانکے گا۔ دن بھر قرض خواہوں کی چیخ پکار ہوگی، کوئی کرایہ مانگے گا، کوئی سود،
کوئی اصل کا خواستگار ہوگا، کوئی حساب کا طلب گار، ایک نہیں دونوں میاں بیوی
اس کے ذمّہ دار ہو، بنا بنایا گھر، جڑی جڑائی جائداد، ہلدی لگی نہ پھٹکری، اس لئے ہاتھ آتی
تھی کہ سنگدلی سے پامال اور بیدردی سے برباد کرو، خیر سمجھتے ہو جو کیا اور دیکھتے ہو
جو کر رہے ہو، اس بکواس کی غرض اس تمہید کا مقصد، اس مبتدا کی
خبر، اس ابتدا کی انتہا، یہ بن باپ کا بچہ دلدار کی یادگار، عرفانی کی نشانی، بھائی
اسرار کا نام مظلوم حسن امام ہے جو تمہارے ظلم کا شکار اور تمہارے ستم کا
نشانہ ہوا۔ اس سے بڑھ کر مظلوم اس سے زیادہ معصوم کون ہوگا جس کو آنکھ کھول کر

ما کی صورت اور باپ کا چہرہ دونوں دیکھنے نصیب نہ ہوئے۔ قدرت نے ما کی آغوشِ محبت اور باپ کے دستِ شفقت دونوں سے محروم کردیا۔ اسلام کی تعلیم یہ تھی کہ ہر ما اس کی ما، اور ہر باپ اس کا باپ ہو، مائیں جب مامتا کے جوش میں کلیجہ کے ٹکڑوں کو لپٹ لپٹ کر دودھ پلاتیں، باپ جب محبت بھری نظروں اور شفقت بھری آنکھوں سے اپنے بچوں کو دیکھتے، تو بھولا بسرا خیال، اچٹتی ہوئی نگاہ اس پر بھی پڑجاتی۔ عزیز اس کو چھاتی سے، مائیں اس کو کلیجہ سے اور باپ اس کو گلے سے لگاتے۔ یہ ایک ما کے بدلے سینکڑوں اور ایک باپ کھو کر بیسیوں باپ پاتا۔ ما کی صدا اس کے کان میں ہر گھر سے، اور باپ کی آواز چپہ چپہ سے آتی۔ مذہب اگر کوئی چیز ہے، قیاس اگر کوئی وقعت رکھتا ہے عقل کے اگر کچھ معنی ہیں تو یہ بدنصیب جو آج آٹھ روز سے خدائی خوار پھر رہا ہے اور تمھاری کمائی میں حقدار ہے، تمھارا شکار نہ ہوتا۔ اس کی بدنصیب ما جو چوبیس گھنٹہ میں چٹ پٹ ہوئی، وہ جوان شبرتی جو ہماری آنکھوں کے سامنے دنیا سے اٹھ گئی وہ ہری کونپل جو پھولنے سے پہلے اُجڑ گئی، ازلی بدنصیب تھی، جس کی تقدیر میں اس لال کی بہار ہی نہ تھی اس نے جوڑ جوڑ کر اور سینت سینت کر ڈیڑھ ہزار روپیہ جمع کیا اور یہ سمجھ کر کہ تم ایمان دار ہو وارث ہو، بھائی ہو، امین بنایا اپنی امانت تمھارے سپرد کی، اس کا شاہد میں موجود ہوں۔ یہ طالب علم، طالب حدیث ہے، اس کی آہ کلیجہ توڑنے اور فریاد عرش کا کنگورہ ہلانے والی ہے۔ تباہ ہو جاؤ گے، برباد ہو جاؤ گے، اس کی اعانت نہ کرو رفاقت نہ سہی۔ مگر خدا کا واسطہ اس کی امانت دیدو۔ یہ مال ہضم اور روپیہ پچنے والا نہیں۔ محنت کا جوڑا اور مصیبت کا جمع کیا ہوا ہے، سلائیاں سی کر اور لپائیاں بیس کر مصیبتیں اٹھا کر اور تکلیفیں بھگت کر فاقے سہہ کر اور چیتھڑے لگا کر بچایا ہے اور اس دن کو کہ اس کمبخت کے کام آئے، تمھارے غضب سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں، تم اپنی رسموں میں، فضول خرچیوں میں عقیقے،

بھولوں میں چھ ہزار سے زیادہ روپیہ کھو چکے لیکن اس کی امانت ہضم کرتے ہو۔ ایک دلداری کی روح نہیں عالمِ بالا کی بہت سی روحیں تمھارے ظلم، اور اس کے صبر، تمھارے ستم، اور اس کے شکر کو دیکھ رہی ہیں۔ بن ماں کا بچّہ اور بن باپ کا لال تمھارے ظلم سے پامال ہو کر حسرت سے تمہارا منہ تک رہا ہے۔ اس کی آنکھ میں آنسو ہیں، اس کے دل میں درد ہے، اس کے لب پر آہ ہے۔ اس کے آنسو کا ہر قطرہ، اس کے درد کی ہر ہوک، اس کی آہ کا ہر حصہ خاک سیاہ کر دے گا۔ ھاجرہ ان حرکتوں سے باز آ، موت قریب ہے، زندگی ختم ہونے والی اور یہ تعلق چھوٹنے والے ہیں، دُور نہیں ہے وہ وقت جب دُنیا تجھ جیسی مشرک اور ظالم عورت پر لعنت بھیجے۔ تیرا اعمال نامہ سیاہ، تیری زندگی برباد، اور تیری عمر ظلموں سے لبریز ہوگی۔ ڈر خدا سے اور اس وقت کو دُور نہ سمجھ جب زبان بند، ہاتھ پاؤں ساکت، اور جسم بے جان ہوگا آنکھ اُٹھا اور دیکھ اس مظلوم کی آنکھیں کیا کہہ رہی ہیں۔ یہ آنسو بھول سے رخساروں پر نہیں، فرشتوں کی گود میں ہیں۔ کھڑی ہو جا ھاجرہ یتیم کو کلیجے سے لگالے اس کی امانت دے دے یہ ٹوٹا ہوا دل جڑ کر، کمھلایا ہوا چہرہ کھل کر، روتی ہوئی آنکھیں ہنس کر ھاجرہ تیری دین اور دنیا دونوں کو درست کر دیں گے“

دسواں باب

چالیسویں کو دو مہینے سے زیادہ گزر گئے اور گو بظاہر ان رسموں کا سلسلہ بڑے زور شور سے جاری تھا مگر افعال گزشتہ کے اثرات روز بروز انعام کو برما رہے تھے۔ دیکھتا تھا کہ بیوی کے ایک ہی جکّر میں اور ناعاقبت اندیشی کے مختصر سے دور میں سب کچھ کھو بیٹھا اور تمام اثاثہ ٹھکانے لگ گیا۔ چاہتا تھا کہ چھٹی کا باقی زمانہ کسی طرح جلدی ختم ہو جائے اور یہ دن ہوا کی طرح کٹ جائیں، تو ان جھگڑوں سے بچ اور مصیبتوں سے نکل کر رہائی پاؤں اور پھر پلٹ کر گھر کا رُخ نہ کروں، مگر اس تاریکی میں کبھی کبھی روشنی کی ایک ہلکی سی جھلک

بھی نظر آجاتی تھی، جو تمام افکار کو راحت اور آلام کو فرحت بنا دیتی تھی۔ یہ ساس کے الفاظ تھے۔ جو ہر لمحہ تو نہیں مگر دن میں دو تین مرتبہ اس طرح کانوں میں گونج جاتے تھے "اب کے تو سات دودوں دھویا بیٹا ہے"۔ وہ اکثر قرضہ کے بار سے پریشان اور ادائیگی کے خلجان میں پریشان ہوتا، مگر ساس کی توقع اور توقع بھی بدرجۂ کمال جو یقین سے کم نہ تھی، ان افکار اور سوچ بچار کو زائل کر دیتی۔ اس وقت انعام پر دو متضاد حالتیں طاری تھیں گھنٹوں اس خیال میں مستغرق خاموش پڑا رہتا، مگر جہاں بیٹے کی پیدائش کا خیال آیا اور وہ رنج و ملال رفع ہوا، دھاجرہ ابتر۔ کہ گھر تیتر باہر باندھوں یا بجھیتر، پورے دن تھیں جو کچھ بھی نہ کرتیں تھوڑا، پہلے تو تھیں اونی پونی اب ہوئی سو سے دونی جو فرمائیں جائز اور درست تھا، خیال یہ تھا کہ دھاجرہ اور اس کی ماں کی عقل پر تو خیر پتھر پڑے ہی تھے۔ مگر انعام کمبخت اتنا پڑھ لکھ کر شاید اب کچھ عقل پکڑے، مگر تو یہ کوئی رسم ایسی نہ تھی جو نہ ہوئی اور کوئی شرک ایسا نہ تھا جو رہ گیا۔ وہی اٹھوانسے نو مانسے گنڈے اور فلیتے پیر جی کا علاج بدستور تھا۔ انعام کے آگے چاہے دال یا روکھی روٹی آجاتی مگر اُن کے تر بتر پراٹھے اور چک بہ چک سالن میں فرق نہ آسکتا تھا۔ جو اللہ کی بندی اکیلے دم پر سو روپیہ اٹھا ہاتھ جھاڑ ہو بیٹھتی تھی، اوّل تو دوجیا اور پھر تنخواہ رہ گئی آدھی، جس قدر بھی پریشانی کا اظہار کرتی سچی تھی۔ ہمت بڑھی ہوئی، دل کھلا ہوا زیور ختم جائداد فنا، پچاس روپے تھے کس گنتی میں مشکل سے آٹھ دس روز چلتے ہوں گے، باقی سارا مہینہ کٹنا چاہیے تھا اور کٹتا مگر اس طرح کہ آج انگوٹھی گئی تو کل چھلا، پرسوں حلوائی نے کام نکالا اترسوں بلا آنے، ایسے گھر میں برکت کیا خاک ہوتی، اور رونق کیا پتھر، دن بہ خاک اڑتی تھی۔ گھر میں خاک کے تودے تھے باہر قرض کے، نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ دس دس پانچ پانچ روپیہ کے واسطے انعام دن دن بھر گڑگڑیاں کھاتا۔ کوئی پیچھے پر ہاتھ نہ دھرتا۔ بسا اوقات ایسا ہوا کہ دن بھر کا بھوکا پیاسا چاروں طرف کا تھکا

ہارا ٹنچ کرتا آیا اور باہر مردانہ ہی میں، اوّل تو وہ مردانہ ہی کیا خاک رہ گیا تھا، ٹوٹے ہوئے تخت پر ایک آٹا دری اور برابر جھلنگا کھٹولا پڑا رہا اور اپنے حال پر غور کرنے لگا۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ اسی طرح پھرتا پھراتا، ناکام ونامراد، ایک چوبا سا تکیہ سرہانے رکھے لیٹا ہوا تھا کہ سامنے سے بلّا نے آکر سلام کیا، بلّا کی صورت اب انعام کو ملک الموت سے کم نہ تھی، سود کے تین مہینے چڑھ چکے تھے، چوتھا ختم کے قریب تھا۔ سو روپیہ کی رقم بھلا انعام اب کیا خاک ادا کرتے یا کر سکتے، زچہ خانہ کے خرچ کی فکر میں چاروں طرف مارے مارے پھر رہے تھے، صورت دیکھتے ہی سہم گیا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے، جان نکل گئی، اُٹھ کر بیٹھا اور کہنے لگا "تشریف لائیے"۔

بلّا: کیا خاک تشریف لائیں اگر ایسے معاملے پانچ چار اور ہو جائیں تو ہماری زندگی ختم ہو جائے"۔

انعام: "واقعی آپ کو بہت تکلیف ہوئی میں سخت نادم ہوں۔ مگر ایمان سے کہتا ہوں اسی فکر میں دن رات رہتا ہوں کہ خدا آپ سے سرخرو کر دے"۔

بلّا۔ اجی تکلیف وکلیف کو چھوڑئیے۔ آپ نادم ہوں یا خادم، روپیہ کا کام تو روپیہ ہی سے چلتا ہے۔ کہیں باتوں سے تھوڑی ہی نکلتا ہے اور فکر کیا خاک کیجئے گا کون ایسا بیٹھا ہے جو ڈیڑھ سو روپیہ ہاتھ پاؤں پر دے دے گا۔ تنخواہ میں پوری پڑتی نہیں، زیور پلّے رہا نہیں آخر میں بھی تو سنوں کہاں سے ادا کرو گے؟"

انعام۔ دیکھئے اللہ مالک ہے اسی میں کچھ نہ کچھ ہو جائے گا، آپ کی رقم انشاء اللہ پہنچ جائے گی۔ پندرہ دن کی مہلت اور دید یجئے"۔

بلّا۔ پندرہ دن، میں تو قریب دو مہینہ سے دیکھ رہا ہوں میں اب پندرہ منٹ بھی نہیں ٹھہر سکتا اسی وقت لیکر جاؤں گا، وہ تو کل دعویٰ دائر کر رہا تھا، میں نے کچہری جاتے کو روکا ہے کہ کل نہ آئیں تو شوق سے دعویٰ دائر کر دینا، ساتھ ہی وہ کچی قرقی کی فکر میں

ہے۔ اچھی طرح کان کھول لیجئے۔ کبھی پھر کہئے کہ میری عزّت گئی اور آبرو گئی۔"

انعام:" آپ کے احسان مجھ پر اتنے ہیں کہ میں اُن کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔ آپ نے اگر سچ پوچھئے تو عزیزوں کو بھلا دیا۔ مگر اب اتنی مہربانی اور کیجئے کہ کسی طرح پندرہ روز اس کو اور ٹھہرا لیجئے۔

بلّا:" میں تو پندرہ روز چھوڑ مہینہ بھر ٹھہرا لیتا۔ مگر وہ مانے بھی! اور پھر نقصان بھی تو آپ ہی کا ہے۔ تین مہینے گزر گئے روپیہ کا ڈیڑھ روپیہ تو اب ہو گیا۔ تیرہ دن بعد سود در سود ہو جائیگا۔"

انعام:" خیر آپ اس کا فکر نہ کیجئے۔ کسی طرح اس کو اور ٹال دیجئے۔ میں اس کے الگ ہی کرنے کی فکر میں ہوں۔"

بلّا:" آپ تو بچوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔ ہم نے شروع ہی میں سمجھایا تھا کہ میاں جب سے محصول لگا ہے جائداد کی قیمت مر گئی۔ اونے پونے الگ کرو۔ سود کے چکر میں نہ پڑو مگر تمہاری سمجھ میں نہ آئی اور لیوے ہی گا کون کاغذات سب ہمارے پاس ہیں، فکر ہی آپ کیا کر رہے ہیں، اب بھی الگ کر دو گے تو دس پانچ جھڑ جائیں گے اور جو ایک ششماہی یوں ہی سو گئے تو گرہ سے دیکر بھی پیچھا نہ چھوٹے گا۔"

انعام:" میں تو موجود ہوں آپ اس کام کو کر دیجئے تو بہت خوش ہوں۔"

بلّا:" آپ جانتے ہیں میں اپنی طرف سے آپ کی خدمت سے باہر نہیں مگر مال زیادہ کا نہیں، دیکھئے کوشش کروں گا۔

انعام:" جب الگ ہی کرنا ٹھہرا تو پھر دیر کاہے کی؟ مجھے جلدی ضرورت ہے"

بلّا:" آپ بھی کیا مزے کی باتیں کرتے ہیں وہ بجت ہی کونسی نوّے ٹکے کی ہے کہ ضرورت اس سے پوری ہوگی۔ کوئی ایسا ہی گانٹھ کا پورا اور آنکھوں کا اندھا مل گیا تو دے پٹخوں گا۔ غضب تم نے یہ کیا کہ شروع ہی میں پوری رقم لے بیٹھے مسلمان کی جائداد مسلمانوں کے محلے میں ہندو کو غرض کیا کہ اپنا بازار محلہ چھوڑ پر محلے سودا کرے۔ لنگڑے نواب کو تم جانتے ہو،

حسنو والی دُکانیں اور ادھر کا کوٹھا الگ کرنے کی فکر میں ہیں مسات ہزار کی خرید ہے، پانچ ہزار تک دیتے کو تیار ہیں۔ مگر گاہک نہیں جُڑتا، لاؤ تم بیانہ دو، کل ہی معاملہ ہوتا ہے"!

کہانی بڑی اور وقت تھوڑا مختصر یہ کہ بلّا نے تین سو روپیہ انعام کو اور بھجرائے اور مکان قبضہ میں کیا۔ پندرہ روپیہ ماہوار کا مرخط لکھ اب انعام کرایہ دار کی حیثیت سے گھر میں رہنے لگے۔ اس واقعہ کو تیسرا روز تھا کہ آدھی رات کے وقت گھر میں غُل غپاڑہ مچا اور صبح صادق کے وقت انعام ایک اور لڑکی کے باپ بن گئے۔ گمان غالب یہ تھا کہ توقعات سے نا اُمید اور اس کیسے جو لگائے بیٹھے تھے، مایوس ہو کر انعام شاید راہ راست پر آجائے اور سمجھ لے کہ ولادت جو بجائے خود ایک مصیبت اور بسا اوقات والدین کے لئے بھی آفت ثابت ہوتی ہے، قدرت کی ضرورت اور فطرت کا تقاضا ہے مگر وہ کمبخت تو کچھ ایسا ہاتھ دھو کر عقل کے پیچھے پڑا تھا کہ انسانیت اُس سے ہزاروں کوس دُور تھی۔ ساس کے اس ہی ایک فقرے نے کہ "بیٹی پیغمبر کا سلام ہے، اللہ کا شکر ہے میری بچی کی جان بچی" اس کی افسردگی کو راحت سے بدل دیا۔ اب اس کی دُنیا اور زندگی صرف ایک بچی اور بیوی کی ہستی میں محدود تھی۔

گیارھواں باب

لڑکی اوّل تو یوں ہی ماباپ سے چمٹنے والی ذات ہے اور پھر انعام کی بچی ناصرہ تو کچھ ایسی بلا کی طبیعت اور غضب کا ذہن لائی تھی کہ دس مہینے کی جان گھسٹنی گھٹانی لڑکنی لڑھکاتی آئی باپ کی پٹی پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔ انعام اوّل تو سیدھے سادھے دوسرے ناصرہ کلیجہ کا ٹکڑا تیسرے اس بچی کے تعلق کا یہ حال کہ دم بھر باپ کو نہ دیکھے تو سارا گھر سر پر اُٹھائے، جس قدر دیوانے ہوتے سبھی تھے، نوبت یہاں تک پہنچی کہ بازار بھی جاتا تو بچی کا بچھلا دُم کے ساتھ ہوتا یہ ہاجرہ کی کھلی ہوئی نادانی تھی کہ اس نے جان بوجھ کر اور دیکھ بھال کر شہ دے کر اور موقع نکال کر بچی کو اتنا مائل کیا کہ وہ باپ کے آگے ماں کو بھی بھول گئی وہ صرف دودھ کی محتاج تو

ماں کی ضرور رہ گئی تھی ورنہ ماتھی تو باپ اور باپ تھا تو وہ چھٹی ختم کے قریب تھی اور دونوں اچھی طرح جانتے تھے کہ باپ کا ہر کا ناصرہ کو ادھموا کر دے گا مگر انجام کا سوچ ہوتا تو یہ نوبت ہی کیوں آتی۔ ہاں ایک بات بیوی کے دل میں جم گئی اور وہ یہ کہ لڑکی کا دودھ باپ کے سامنے چھڑوا دوں تاکہ جو کچھ ہونا ہوا ناہے اُن کے سامنے ہی ہو جائے مگر وہ ہوتا اور کرتا کون۔ میاں کے پلے اب رکھا ہی کیا تھا کہ شادی رچتی اور دودھ چھُٹتا، سود کے جھگڑے سے چھوٹے تو کرایہ کی مصیبت آئی۔ رقم کا دینا تو آخر دینا ہی تھا، سود کے نام سے نہیں کرایہ کے نام سے، ناک اِدھر سے نہ پکڑی اُدھر سے پکڑ لی۔ آنکھ بند کر کے چار پانچ مہینے کرایہ کے چڑھ گئے مکان دار ہر وقت کے حیلے حوالے اور یہ دن رات کے قصے قضئے کہاں تک سنتا۔ نالش گردی، ستّر اسی روپیہ کی رقم اب بھی ایسی نہ تھی کہ انعام ادا نہ کر سکتا۔ لاکھ بگڑ چکا تھا، اور بنا بنایا گھر خاک میں مل چکا تھا۔ پھر بھی بڑوں کا نام لیوا اب بھی سوا لاکھ ٹکے کا تھا۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ قرضہ کی کوئی حد نہ خرچ کی کوئی انتہا، قرض خواہوں کی تو بھیڑ چال تھی، نالش دیکھ سب کے کان کھڑے ہو گئے اور تقاضوں کی بھرمار شروع کر دی۔ انعام کی زندگی کا یہ دور بھی عجب مصیبت ناک تھا، صبح کا نکلا کہیں دوپہر، تیسرے پہر کو آکر پڑ رہتا، کھانا برائے نام رہ گیا۔ وہی انعام جو باپ کی زندگی اور ماں کے سامنے آدھ سیر گوشت اس طرح چٹ کر جاتا کہ طشتری کی ریخیں تک صاف نظر آتیں اُلٹے سیدھے پانچ چھ نوالے مار" الٰہی تیرا شکر" کہہ دیتا۔ جوانی اب ڈھل چکی تھی، عمر رو بہ انحطاط، ہاتھ پاؤں میں سکت رہا نہیں، چند ہی روز میں برسوں کا بیمار معلوم ہونے لگا۔

بچی کو کلیجہ سے لگائے، مردانہ میں کھرے کھٹولے پر دری نہ تکیہ آنکھیں بند کئے پڑا سوچ رہا تھا، چاروں طرف نظر دوڑاتا، مگر کوئی صورت ادائگی کی نظر نہ آتی تھی، جوا کھیلا نہ تھا، چوری آتی نہ تھی، ڈاکہ کے قابل نہ تھا، بھیک البتہ ایسی چیز تھی جو کبھی مولویت کی آڑ میں، کبھی علمیت کی اوٹ میں، تھوڑی بہت تسکین دیتی تھی۔ گھر میں آنا جانا بھی رسمی رہ گیا تھا، دن کو

جوگیوں کی طرح گیا، ایک پھیری ماری اور چلا آیا، رات کو چوٹوں کی طرح آیا اور پڑ رہا۔ قرض خواہوں کا سہم اتنا چڑھ گیا تھا کہ مردانہ میں بھی لیٹتا تو اندر سے کنڈی لگا کر۔ حالت کا یہ تغیر، مصائب کی یہ انتہا۔ افکار کی یہ کثرت، دونوں ہی کے سامنے تھی اور دونوں متعلق بھی تھے اور سچ پوچھو تو اصل گنہگار بیوی ہی تھی جس نے اپنی بدکرداریوں سے میاں کو یہ دن دکھایا لیکن اُس کی بےحیائی اس درجہ ترقی کر گئی تھی کہ اول تو وہ کسی کو قصوروار سمجھتی ہی نہ تھی اور صرف تقدیر کو اس انقلاب کا ذمہ دار کہتی تھی، اور اگر کبھی ایسا ٹیڑھا موقع آجاتا اور گفتگو میں اتنی دب جاتی کہ اقرار کرنا ہی پڑتا تو سارا بار میاں کے سر دھوپ دیتی۔ دن گذرے جاتے تھے اور جانے کے خیال سے انجام کا خون خشک ہو رہا تھا۔ ارادہ کیا کہ بیوی کو ساتھ لے لوں، مگر ساتھ ہی یہ خیال آیا کہ دروازہ کھلا ہوا ہے تو پھر کچھ ہوا بندھی ہے۔ یہ بند ہوا تو چار دن میں قرض خواہ آفت مچادیں گے نہ معلوم قرقی آئے، گرفتاری ہو، کیا ہو، کیا نہ ہو۔ اب خیال آیا کہ بچی تو دو ہی دن میں سر ٹپک ٹپک کر مر جائے گی، دم بھر کو باہر جاتا ہوں تو چیخ دھاڑ مچادیتی ہے، مگر اب خیال کس کام کا، پچھتانا بےسود، اور بے کار۔ نوکری چھوڑ نہ سکتا تھا، بیوی ساتھ جا نہ سکتی، ہر وقت یہی فکر سوار اور اسی ادھیڑبن میں گرفتار رہتا۔ مگر صد آفریں ہاجرہ کو کبھی آئندہ کا فکر بھول کر بھی تو اُس کے پاس نہ پھٹکا۔ اس کو تو وہی دودھ چھٹنے کی رٹ، اور شادی کا وظیفہ تھا۔ جانتی تھی کہ قرضہ کی تھانی چڑھی ہوئی ہے، جائداد کو پہلے ہی آگ لگ چکی تھی، اسباب یوں خاک میں ملا، ہاں ملّا کی دوڑ مسجد، ٹھوس کڑے ہاتھ میں موجود ہیں! اب بڑوں کی یادگار، وقت بے وقت کا اثاثہ، جو چاہے سمجھ لو، مگر وہ اپنی دُھن کے آگے ہر بات کو ہیچ سمجھتی تھی، دو چار دفعہ میاں کے منہ پر رکھا۔ اور کہا سُنا، مگر جب دیکھا کہ وہ صاف ٹال گیا، اس کان سُنا اور اُس اُڑا دیا تو بپھر گئی۔ شام کے وقت ایک روز اِدھر انعام کھانا کھا کر اٹھا، اُدھر اس نے اپنی کتھا کہنی شروع کی۔

"دودھ تو آخر چھٹنا ہی ہے تمہارے سامنے چھٹ جاتا تو اچھا تھا، دیکھ رہے ہو کیسی ضدن لڑکی ہے میرا دم ناک میں کر دے گی۔ ادھر تمہارا اٹھرکا ادھر دودھ کا، تم ہو گے تو پھر بہت کچھ بہل جائے گی، نہیں تو یوں ہی تڑپ تڑپ کر مرے گی۔ میرے ساتھ کیا یہ تو اس معصوم کے ساتھ دشمنی ہے۔ اس سے تو یہی بہتر ہے کہ اپنے ہاتھ سے پیسہ کی افیم لا کر کھلا دو"

میاں:۔"میں نے کب منع کیا ہے۔ ابھی بسم اللہ کرو، دودھ چھٹانے میں کیا ہاتھی گھوڑے لگتے ہیں، مگر تم تو نکاح کی سی شرطیں کرتی ہو۔ پیسہ پاس ہو تو لو لادے سے زیادہ کیا ہے۔ تمہارے نزدیک لڑکی پیغمبر کا سلام ہے مگر میرے واسطے تو موت کا پیغام ہو گئی۔ اور کوئی دن کی ہوا کھا رہا ہوں، پھر جائے چھٹنی شادیاں رچا لینا۔ روپیہ پاس نہیں، قرض ملتا نہیں، ہاں چوری رہ گئی۔ کوئی جگہ بتا دو جا کر چرا لاؤں گا"

بیوی:۔"تم کیوں مرنے لگے خدا مجھ ہی کو موت دے جو اس عذاب سے چھوٹوں لوگوں کے ہاں آٹھ آٹھ، دس دس بچے ہوتے ہیں، اور دنیا ان کی بہار دیکھتی ہے، میرے ہاں ایک پھونسڑا ہوئی ہے، اس کو دن رات اگٹ رہے ہو۔ میں تم سے کچھ مانگتی نہیں مگر اس ظلم کی بھی کوئی حد ہے کہ اپنے پاس سے بھی کچھ نہ کروں۔ میرے دل میں تو ارمان ہے میں تو پورا کروں ہی گی"

میاں:۔"تم شوق سے کرو میں منع نہیں کرتا۔ مگر کڑوں کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھنا، ابھی تو میرا جانا ہی سر پر ہے۔ کم سے کم پچاس روپیہ تو مجھے ہی چاہئیں۔ اس کے علاوہ ایک چیز رہ گئی ہے نہ معلوم کیا وقت ہے کیا نہیں، سائیں کے سو کھیل ہیں"

بیوی:۔"تم کڑوں کے مالک کہاں سے ہو گئے، میری چیز ہے جو چاہے کروں، تمہارے خرچ کو دیدوں اور بچی کا دودھ خالی خولی چھٹا دوں؟ کھجوریں نہ مرنڈے؟ خاک میں نہ ملا دوں ان کڑوں کو۔ صدقے کر کے پھینک دوں اپنی بچی پر سے"

میاں:۔"تم ہر وقت لغو باتیں کرتی ہو۔ نوبت یہاں پہنچا دی اور جو کچھ کرنا ہے،

کرکرا کر الگ کردو جیل خانہ جانا باقی ہے پہنچوا دو۔"

بیوی:۔ "جب میں دشمن ہوں تو میرا منہ کالا کرو۔ اب میرا یہاں کیا کام، مگر شرافت کے معنی یہ ہیں کہ اب میری طرف رُخ نہ کرنا۔"

میاں:۔ "شرافت اور رذالت کا ذکر نہیں ہے۔ میں نے ایک معقول بات کہی، تم گھر سے نکلنے کو تیار ہو گئیں۔ ہو تو اولاد سے زیادہ کیا ہے۔ صدقہ کیا جب تک تھا، میں نے کبھی منہ موڑا۔ کیا نہ کیا؟ چلّے، عقیقے، چالیسواں، پھول، کونسی رسم ناغہ کی۔ اب نہیں ہے تو کیا کروں، ہاں گڑے تو میں قیامت تک نہ بکنے دوں گا۔"

بیوی:۔ "تم ہو کون جو نہ بکنے دو گے، میری چیز، میرا مال، کھلے خزانے بیچوں، بیچ بازار بیچوں، دکھا دکھا کر بیچوں، جلا جلا کر بیچوں، مجھے تو گڑے اپنی بچی سے زیادہ نہیں۔"

میاں:۔ "تمہاری ہستی کیا ہے کہ تم بیچ سکو، جہاں تک دب رہا ہوں سر پر چڑھی جاتی ہو۔ خبردار جو زیادہ بڑبڑ کی۔ کمبخت نے بھیک کا پیالہ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ اور اب بھی صبر نہیں ہے۔ شریف ہوتی تو احسان مانتی۔ رذیل تھی، ذلیلوں کی ذلیل!"

بیوی:۔ "بس منہ سنبھال کر بولو، رذیل ہو گے تم آپ۔ میرے باوادا کو کہا تو خون پانی ایک کر دوں گی۔ تم اپنا گھر لئے بیٹھے رہو۔ میں غارت ہوتی ہوں۔ ور دکھا دونگی کہ ذلیل ہوں یا شریف۔"

انعام بیٹھا منہ دیکھتا رہ گیا، اور بیوی ڈولی منگوا، بچی کو گود میں لے، یہ جا وہ جا!!

بارھواں باب

تین بجے دن کے یہ واقعہ ہوا، پانچ بجے گڑے بکے، چھ بجے بلا وے پھرے اور سات بجے دودھ چھٹ گیا، چٹ منگنی، پٹ بیاہ تھا کہ ڈھائی تین گھنٹے میں سب مرحلے طے ہو گئے۔ ہاجرہ ڈولی میں بیٹھی یہ سمجھ کر کہ انعام مجھ سے پہلے سسرال پہنچے گا، مگر مرد تھا انعام بھی اکڑ رہیں ڈوبا، مصیبت میں پھنسا۔ بچی کے بلکنے کا خیال

زیادہ تڑپا تو بہت مگر پھر یہی سوچا کہ آخر یہ دن تو آنا ہی ہے کیوں بات بھی کھوئی۔ رات جس طرح ہو کاٹ دو، صبح دیکھی جائے گی لیکن صبح پوری ہوئی بھی نہ تھی کہ کہار بریانی زردہ کے خوان لیکر پہنچا اور کہا "آپ کی اماں جان نے حصہ بھیجا ہے، دودھ چھٹ گیا"۔ سنتے ہی آگ لگ گئی چھٹی میں ابھی پانچ چھ روز باقی تھے، مگر ایسا غصہ چڑھا کہ بنئے سے پندرہ روپے لیکر گھر کو قفل لگا نوکری پر روانہ ہو گیا۔

بچی، اِدھر تو چھٹا دودھ، اُدھر جدا ہوا باپ رات تو خیر جوں توں گزر گئی مگر مہمانوں کی رخصت سے پہلے ہی جب اس نے بلکنا شروع کیا تو کھڑے چین تھا نہ بیٹھے۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ وہ ہچکیاں کھائی ہیں کہ الامان! والان بھر میں لوٹیں لگاتی پھرتی تھی۔ بہتیرا ماما اور نانی چمکارتیں اور لیتی تھیں مگر گود میں آنا تو درکنار اس نے قلابازیوں کا وہ تار لگایا کہ کسی طرح قبضہ ہی میں نہ آتی تھی۔ ہاجرہ کے پاس لے دے کر دو علاج تھے کنڈیاں کھٹکھٹاتی اور پٹاری بجاتی۔ مگر ڈیڑھ پونے دو برس کی بچی ان چکموں میں کیا آتی۔ دوپہر تک یہی فیل مچائے ایک بجے کے قریب ہلکان ہو کر پڑی تو آنکھ لگ گئی۔ لوگ جا چکے تھے ہاجرہ بھی رات بھر کی تھکی ہاری تھی برابر میں لیٹ گئی۔ ہاتھ رکھتی ہے تو بچی کا بِنڈا بھاڑ بھبھن رہا تھا، جان نکل گئی، پیرجی کو بلایا سولہ سترہ روپے باقی بچے تھے وہ ان کی نذر ہوئے بچی نے آنکھ کھولی تو دودھ کا ذکر تھا نہ بخار کا ایک ابا کا لفظ تھا جس کی تسبیح پڑھ رہی تھی۔ چاروں طرف آنکھیں پھاڑ کر دیکھتی اور پھر بخار کے غوطہ میں پڑ جاتی۔ بخار اور بخار کے ساتھ بیہوشی لحظہ بہ لحظہ تیز ہو رہی تھی۔ لینے کے دینے پڑ گئے تین سال کی محنت اور دو سال کی پلی پلائی بچی ہاتھوں میں تھی۔ اب البتہ ہاجرہ کی آنکھیں کھلیں۔ مامتا کے جوش میں اس کے منہ پر منہ رکھتی اور ہوشیار کرتی مگر اس بلا کی بیہوشی تھی کہ بچی آنکھ ہی نہ کھولتی۔ کبھی کہتی "لے چل، ‌ دلی آئی، گھر چلیوں" کبھی کہتی "ے ناصر ابا آئے"۔ مگر ابا بے کار اور ڈولی بے سود، کلیجہ نکلتا پڑتا تھا۔ ڈاکٹر کو بلایا اس نے صاف کہدیا، "بخار بہت تیز ہے

سرسام کا اندیشہ ہے، دوا دو، اللہ آرام دے گا، اتنا سنتے ہی ھاجرہ بیتاب ہو گئی، ڈاکٹر کا جانا تھا کہ بچّی سے لپٹ گئی اور ایک چیخ مار کر یہ کہتی ہوئی گری "ہائے میرے اللہ میں کیا کروں"! بخار کو جنبش تھی نہ بیہوشی میں فرق، دیوانوں کی طرح سارے گھر میں پھر پھرا کر آتی اور اس کا منہ تکتی، تلوؤں سے آنکھیں ملتی، قربان ہوتی، نثار ہوتی، سر پر ہاتھ پھیرتی، گلے میں بانہیں ڈالتی، مگر بیہوشی کا یہ عالم تھا کہ بچّی کو آنکھ کھولنی قسم ہو گئی۔ اسی حالت میں ڈولی منگوا بچّی کو گود میں لے، گھر چلی جھینپتی پیٹتی اُتری اور روتی ہوئی گھر پہنچی تو قفل لگا ہوا تھا محلہ والوں سے معلوم ہوا کہ میاں گئے۔ یہ اور بھی زبردست چرکا لگا۔ تقدیر کو پھوڑتی اور قسمت کو پیٹتی پھر میکے لوٹی بچّی کیا گود میں ایک مردہ تھا جس میں سانس کے سوا کوئی حرکت ہی نہ تھی جھنجھوڑتی تھی اجگاتی تھی، پیار کرتی تھی چمکارتی تھی، اور سب طرف سے مایوس ہو کر پڑ جاتی تھی لیٹے لیٹے پھر ہوک اُٹھتی، جوش آتا، جاتی، دُور سے دیکھتی، کلیجے میں گھونسے لگتے، آنکھوں میں اندھیرا آتا، باہر آتی، آسمان کو دیکھتی اور پھر پلٹ کر چلی جاتی۔ دِل بجھ گیا تھا آنسو خشک ہو چکے تھے سرہانے آ کر بیٹھ گئی، اور ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی۔ دفعتہً خیال آیا کہ میری جان تھوڑی دیر کی اور مہمان ہے خفا ہو گئی، اس لئے کہ میں نے دودھ عزیز کیا، جھک گئی، پیار کیا اور کہا "ننھی سی بیگم! دُودھ اور میں قربان، تیرا دودھ تجھے نصیب کرے، غلطی ہوئی، قصور ہوا، معاف کرو، لے دودھ پی" دیوانگی کی حالت یہ تھی کہ دودھ کھول کر بچّی کے منہ میں دینا چاہا مگر یہ جو کچھ تھا سب فضول اور بے کار۔ بچّی کو خبر بھی نہ تھی، تھوڑی دیر پاس لیٹی رہی۔ پھر مامتا نے جوش کیا، اُٹھی دیکھا بیہوش تھی، منہ پر ہاتھ، ٹھنڈا سانس لیا، بیٹھی، اُٹھی کھڑی ہوئی، آنکھ سے چہرہ دیکھا، ہاتھ سے پنڈا دیکھا، بیہوشی بدستور، بخار اسی طرح، ایک آہ کی اور سر پکڑ کر بیٹھ گئی، اب آدھی سے زیادہ رات گزر چکی تھی اور اس ڈھنڈار گھر میں ایک ماں اپنی بچّی کے آخری سانس گن رہی تھی۔ موت چیل کی طرح سر پر منڈلا رہی تھی اور قریب آ گیا تھا وہ وقت کہ ھاجرہ کی بھری ہوئی گود خالی ہو جائے۔ ایک بچّی کی موت دیکھ چکی تھی، تھوڑا

بہت تجربہ بھی تھا جب اُمید قطعاً منقطع ہوگئی اور دل نے اندر سے صدا دی کہ جس پھول کے ساتھ زندگی کی تمام بہاریں وابستہ تھیں وہ اب مُرجھا رہا ہے، اس ہرے بھرے باغیچہ میں جہاں بے فکری کے سرسبز و شاداب پودے مہک رہے تھے، موت پیغام خزاں لے آئی، گھر سے چلی ہوں تو وہ شبِ عیش کی صبح تھی اور اب وہ صبح بھی دوپہر خزاں سے بدل گئی تو لٹی چاروں طرف پھری اور قربان ہو کر بیٹھ گئی عقل زائل ہو چکی تھی، دل بگڑ چکا تھا جھکتی تھی، غور سے دیکھتی تھی کبھی سانس کبھی نبض جب سانس بگڑنے لگا اور یقین کامل ہو گیا کہ یہ آنکھ ہمیشہ کو بند اور زبان سدا کے واسطے ساکت ہو گئی، دنیا کی کوئی طاقت زندگی کی کوئی کوشش حکیم کی کوئی دوا اور ڈاکٹر کا کوئی نسخہ اب ناصرہ کو زندہ نہیں کر سکتا تو سمجھی کہ آن پہنچا ہے کہ وقت جب یہ جسم بیجان ہوگا اور کلیجہ کی کور صرف ہڈیوں کا ڈھیر رہ جائے گی تو گلے میں ہاتھ ڈال کر لپٹ گئی۔ لپٹتے ہی بیہوش ہوئی، بیہوش ہوتے ہی ایک دوسرا منظر آنکھ کے سامنے تھا، بچی مر چکی ہے نہلا دھلا کر کفن پہنا دیا اور لیجانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں دیواروں سے ٹکریں مارتی ہر طرف سر پھوڑتی ہے۔ سامنے آنکھ اُٹھا کر دیکھتی ہے تو باپ جس کو مرے بارہ برس سے زیادہ ہو چکے تھے، سفید کپڑے پہنے خاموش کھڑا ہے کلمہ کی انگلی دانتوں میں ہے اور نگہ خشم آلود بیٹی کے چہرہ پر۔ بیتاب ہو رہی تھی آگے بڑھی، چاہتی کہ قدموں پر گرے مگر باپ نے جھٹک دیا اور کہا "ہٹ جا۔ اپنے ناپاک ہاتھوں سے میرے جسم کو گندا نہ کر، تیری زندگی کا جو دن گزرا وہ بد اور جو رات گزری وہ بدتر۔ ایک مشرک عورت، ایک نافرمان لڑکی، ایک گنہگار مخلوق، ہرگز اس قابل نہیں کہ میرے جنتی لباس اور پاک جسم کو ہاتھ لگائے، تیری آج تک کی زندگی کا ٹرا کار نامہ عزیز سرمایہ گراں مایہ جائداد اور سب سے بڑا اثاثہ قادرِ ذوالجلال سے روگردانی ہے، دوزخ کے شعلے اور آگ کی لپٹیں تیری منتظر ہیں۔ موت تیری ہستی کا خاتمہ کرنے کو تیار۔ تیری اُمنگیں اور خواہشیں حوصلے اور ارمان کیا تھے چار دن کی چاندنی اور پھر اندھیرا گھپ آج وہ ارمان اور مہمان

رسمیں اور منتیں پیر اور رفیقِ کہاں ہیں، موسم بہار کے بلبل تھے، چہچہا کر اڑ گئے اب تو ہے اور تیرے اعمال۔ بھگت جو کیا، کاٹ جو بویا اور رے جو دیا۔ کھائے گی جو بچایا اور پائے گی جو بھیجا، تیری امانت موجود، تیرا حصہ تیار۔ تیری زندگی کا مقصد، اپاہجوں کی خدمت، یتیموں پر شفقت، غریبوں پر عنایت، بیکسوں کی حمایت اور مظلوموں کی اعانت تھا۔ دکھے ہوئے دل جوڑتی، ٹوٹے ہوئے دل تسکین اور زخمی دل تیرے ہاتھوں آرام پاتے، اجڑی ہوئی کھیتیاں خونِ جگر سے سینچتی اور مرے ہوئے دل اپنے ہاتھ سے زندہ کرتی۔ تیری بچی ناصرہ مر چکی، یہ چہکتی ہوئی مینا اور مہکتا ہوا پھول ختم ہوا لیکن اس کا بنانے والا مالک زندہ ہے اور یہ وہ مالک ہے جس کے آگے تیرا سر کبھی نہ جھکا مگر اس نے اپنے کرم سے تجھ کو محروم نہ رکھا۔ دو رہیں تیرے پاس ہے، طلب کر عطا کرے گا۔ گڑگڑا، سنے گا، التجا قبول کرے گا۔ ھاجرہ سب طرف سے مایوس ہو چکی، اب اس کو سجدہ کر جو مردہ کو زندہ اور زندہ کو مردہ کرنے والا ہے۔"

باپ کا آخری فقرہ اس قدر پُر جوش تھا کہ آنکھ کھل گئی۔ دل دھڑک رہا تھا اور آپ کانپ رہی تھی۔ دیکھا تو بچی برابر بیہوش پڑی ہے۔ موت کا خیال آتے ہی کلیجہ سے لگایا مگر وہ تو واقعی مردہ تھی، جس میں ایک خفیف سی آواز سانس کی موجود تھی۔ اٹھی تو رات کا سناٹا، نیم کی پتیاں اور آسمان کے تارے خالق الموجودات کی زبردست قدرت کارات کے اندھیرے میں پتہ دے رہے تھے۔ غور کیا تو واقعی نماز پڑھے ہوئے بارہ برس سے زیادہ ہو گئے سوچنے لگی کہ اللہ اللہ ایسی کمبخت عورت کون ہوگی جو پورے بارہ سال خدا سے فرنٹ رہی اور اسی پر بس نہیں۔ شرک کیئے، قبروں کو پوجا، مگر اس کی ذمہ دار میں اکیلی نہیں، ساری سسرال ہے اور میکہ بھی اس الزام سے پاک نہیں، کوار پنے میں کیسی پابند تھی کہ بڑے ماموں جان کے نکاح میں سمدھیانے میں جا نماز لیکر فرض پڑھے مگر شادی ہوتے ہی خدا کو چھوڑ بیٹھی۔ اور رہا یوں ہی ہیں گنڈے دار ہو گئی تھی سسرال میں پہنچکر تو بالکل ہی صفایا ہو گیا پہلے روز دلہن بنی جھکی بیٹھی تھی، جیسیوں

بیویاں گھیرے تماشہ دیکھ رہی تھیں ظہر، عصر، اور مغرب اور عشاء چاروں قضا ہوئیں اور ایک مسلمان کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ نماز پڑھ وا دیتا خیر وہ شرم و حجاب دس بیس روز کا تھا اس کے بعد پڑھتی۔ ہائے میری تقدیر! خبر نہیں ایک ایک دن میں کتنے سانس لیئے مگر ایک سانس بھی خدا کی یاد میں نہ گزرا۔

حرکات ناشائستہ

اِن خیالات کا دِل میں آنا تھا کہ پہلی زندگی کا تمام نقشہ اور اپنے کرتوت آنکھ کے سامنے پھر گئے۔ اِدھر بچی کی موت کا یقین اُدھر خرابی عاقبت کا واقعی احتمال۔ اُٹھی مگر مامتا کے آگے عاقبت ہیچ تھی اور مشکل سے دو چار لمحہ وہ تصوّر قایم رہا ورنہ وہ تھی اور بچی کا خیال، گم سُم بیٹھی تھی کہ ماں نے کہا۔ "بیٹی! اتنا اتنا تم کو سمجھایا کہ احمد جی کے مزار کی چادر بھیجدو، مگر تمہاری سمجھ میں خاک نہ آیا۔ اُس وقت سُنا نہیں، اب رونے بیٹھ گئیں پانچ نہیں چھ روپیہ اُٹھ جاتے بچّی سے زیادہ نہیں تھے۔ ایسا بھاری عُرس جس میں دور دُور سے خلقت آکر جمع ہو اور سینکڑوں ہزاروں اُٹھائے کچھ تو ہے جو ہر سال اس زور شور اور دھوم دھام سے کرتے ہیں۔ مگر تمہارا کیا قصور ہے، وہ تو تقدیر جب بلٹتی ہے تو سامان ہی ویسے ہو جاتے ہیں۔ آج کل تو ایسے بزرگ وہاں آئے ہوئے ہیں کہ شہر کیا ساری دُنیا اُن کو پوج رہی ہے۔ دِن بھر آدمیوں کا تانتا لگا رہتا ہے جو تعویذ ہے وہ اکسیر، بوا حمیدہ کے میاں کو حکیم اور ڈاکٹر سب جواب دے چکے تھے۔ پھوڑے کا یہ حال تھا کہ ایک چیخ آسمان اور ایک زمین تھی، بیچاری کو ڈولی میں ڈال لے گئی۔ وقت کی بات تھی بیٹھے تسبیح پڑھ رہے تھے۔ ایک تعویذ دیا کہ جاتے ہی گھول کر پلا دو۔ پانی کیا حضرت علیؓ کا لب تھا کہ دو ہی گھونٹوں میں پھوڑے کا پتہ تک نہ رہا۔"

ہاجرہ۔ "تو میں نے کب انکار کیا تھا تم نے پھر یاد ہی نہیں دلایا، اب تو ڈولی ملنے کی نہیں۔ دو بج رہے ہیں نہیں تو ابھی چلی چلتی، چلیئے صبح ہی چلی چلیئے۔"

ما۔ نہیں یہ تو کیا جانے کا وقت ہے، اور اُن کے نزدیک تو دن رات دونوں

برابر ہیں۔ سُنا ہے کہ رات بھر نماز پڑھتے ہیں۔ کبھی سوتے ہی نہیں۔ ہما شما سے تو بات ہی نہیں کرتے، جس سے بات کر لی بس سمجھ لو بیڑا پار ہے۔"

ہاجرہ "آئے ہے مجھے کیا خبر تھی میں تو ایک چھوڑ چار چادریں چڑھا دیتی، اور بس دفعہ چلی جاتی۔ مجھے اس سے زیادہ اور کیا ہے۔"

ماں کے ایک ہی صیقل کے رگڑے نے وہ رنگ کہیں کا کہیں پہنچا دیا۔ نہ خوف خدا رہا نہ عذاب کا ڈر۔ خدا خدا کر کے رات کاٹی اور نماز سے پہلے دونوں ماں بیٹیاں ڈولی میں بیٹھ احمد جی کی درگاہ پہنچیں، شاہ صاحب ٹخنوں سے اونچا کرتہ، بڑی بڑی زلفیں، ڈاڑھی سفید بگلے کا پر، ہاتھ میں تسبیح، مُنہ میں بڑبڑاہٹ، آنکھیں بند، بیٹھے جھوم رہے تھے، مریدوں نے دُور ہی سے دیکھ کر ڈانٹ بتائی "ٹھہر جاؤ، آگے نہ بڑھنا، حضور مراقبہ میں ہیں، دونوں ٹھٹک گئیں۔ ایک مرید آگے بڑھا اور کہا "کیا یہ بچہ بیمار ہے، دس بجے حضور مراقبے سے فارغ ہوں گے تو دَم کر دیں گے۔"

ہاجرہ "حضرت یہ تو شام ہی سے بیہوش ہے آپ دیکھیں تو سہی"

مرید "ہم سمجھ گئے، ہم کو معلوم ہے۔ ادھر کونے میں بیٹھ جاؤ۔"

ہاجرہ "حضور سے عرض تو کر دو شاید دیکھ لیں۔"

مرید "حضور مراقبہ میں ہیں، کیسے دیکھ سکتے ہیں۔"

ہاجرہ "ہم تو بہت دُور سے آئے ہیں اس وقت تو کسی طرح دکھا دیجئے بڑا احسان ہوگا۔

مرید "دس بجے کے بعد، تم موکلوں کی نیاز کے لئے مٹھائی وٹھائی لے آئی ہو؟"

ہاجرہ کی ماں "حضور جو کچھ حکم دیں گے وہ حاضر کر دیں گے، مگر وہ ایک نظر ڈال لیں

مرید "حضور تو لاکھ روپے پر بھی نہ تھوکیں، تمہاری پونجی کیا ہے۔ نیاز ہے وہ ہم دیدیں گے، نکالو پانچ روپے اور پانچ ٹکے موکلوں کے۔"

مرید صاحب کا فرمانا ٹل کیسے سکتا تھا۔ ہاجرہ نے پانچ روپیہ ڈھائی آنے

اُن کی نذر کیے اور وہ یہ کہتا ہوا چلا گیا "خبردار جو کسی سے ذکر کیا میں حضور کو لاتا ہوں دونو کی دونو خاموش کھڑی ہو جاؤ"۔

حضور کے لانے میں کون سے ہاتھی گھوڑے درکار تھے وہ تو مرید صاحب کی اڑان گھائیاں تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد حضور آ گئے دم کیا، تعویذ دیا اور بغیر بونے چالے چلے گئے۔ دونو ماں بیٹیاں لوٹیں رستہ میں ہاجرہ کی پھوپی زاد بہن رہتی تھی جس کا شوہر ڈاکٹر تھا ڈولی اس کی دوکان کے آگے سے گذری۔ دو سواریاں اور دونوں بھاری، بانس لچک گیا۔ اور چرا کے ڈولی ٹوٹی، سواریاں گریں، چوٹ لگی سو جدا اور بے پردگی ہوئی وہ الگ ڈاکٹر صاحب نے دیکھا۔ جلدی سے اٹھ، پاس گئے، اور دونوں کو لا کر اندر بٹھایا۔ اُن کی رام کہانی سنی اور بچی کو دیکھا تو دونوں کھلیاں سوڑوں میں صاف جھلک رہی ہیں۔ ایک کہی نہ دو، ماسے پوچھا نہ تاتی سے نشتر نکال، دونو سوڑے کھول، منہ دھو دھلا بچی کو گود میں دے۔ ڈولی میں بٹھا چلتا کیا، گھر پہنچی تو آنکھیں کھول دیں۔ پانی دیا تو غٹ غٹ آدھا آبخورہ پی گئی۔

تیرھواں باب

انعام جو بیج اپنی موجودگی میں بو گیا تھا اور جس کھیتی میں بیوی نے رات دن پانی دیا، اب اس میں پھل آنے کا وقت تھا۔ یہاں سے تو تبدیلی میں سوار ہو گیا، مگر وہاں پہنچتے ہی بیوی کی غربت، بچی کی محبت، اور اپنی قسمت نے مردہ کیا۔ ایک دن تو جوں توں کٹا، اور کام بھی شروع کر دیا۔ مگر ادھر تو بیوی کی ناخوشی کا فکر ہر وقت سر پر سوار تھا ادھر بچی کی تصویر دم بھر کو آنکھ سے اوجھل نہ ہوتی تھی۔ دورے کی نوکری تھی، مگر صبح گئے اور شام آ گئے۔ کیسا کام کاج اور کس کی دیکھ بھال دن بھر جنگلوں کی خاک چھانی اور شام کو آ کے پڑ رہے۔ کام میں خرابی ہوئی، افسروں تک اطلاعیں پہنچیں، حکام تک خبریں گئیں۔ فہمائشیں ہوئیں، غصہ ہوا، لیکن سب بیکار تھا۔ مہینہ ختم ہونے آیا تو یہی نہیں کہ پوری تنخواہ بیوی کو بھیجدی بلکہ ساتھ ہی معذرت کا خط، محبت کا پیغام، غصہ کا افسوس، روانگی کا ملال، اور معافی کا سوال،

گھر کی زندگی پھر غنیمت تھی کہ جب افکار سے اکتاتا، اور جھگڑوں سے گھبراتا تو بیوی کا اغماض بچی کی مزیدار باتیں خیال پلٹ دیتیں، مگر یہاں کوئی اتنا بھی نہ تھا۔ راتیں جھگڑے میں صاف نکل جاتیں، دن بھر گم سم پڑا رہتا، مگر چھٹکارے کی کوئی صورت نظر نہ آتی۔ کھانا پینا چھوٹ گیا، دو دو وقت صاف گزر جاتے، بڑی مشکل سے اور نوکر کے کہنے سننے سے زبردستی بیٹھتا تھا، مگر نوالہ ہی نہ چلتا، آدمی ان کا کیڑا ہے، بدن گھٹنے لگا اور چند ہی روز میں کانٹا ہو گیا۔ ادھر قرض خواہ دو چار مہینے خاموش رہے مگر کہاں تک اور کب تک، دس پانچ تقاضے بیوی پر کئے، دو چار خط میاں کو لکھے، ایک آدھ عرضی افسروں کو بھی اڑا دی۔ جب کسی طرح کام نہ چلا تو دعوے دائر کر دئے، افسر پہلے ہی بگڑ رہے تھے۔ کام کو دیکھا تو وہ چوپٹ، خود بدولت کو دیکھا تو وہ سودائی! چھٹی کی کوئی حد نہیں، آج ایک کا سمن ہے تو کل دوسرے کا، حالت وہ کچھ، آفت یہ کچھ، موقوف کر دیا، گھر آئے۔ ابھی راستہ میں تھے جو خبر لگی کہ گھر کا سارا اسباب برتن بھانڈا، دری اور چاندنی قرق ہو گئے۔ یہ دھکا ایسا لگا کہ آدھی جان رہ گئی۔ گھر پہنچا تو واقعی خاک اڑ رہی تھی۔ بیوی تھیں تو وہ میلے کچیلے کپڑے پہنے بڑے گھر کی باندی بنی بیٹھی تھیں۔ بچی تھی تو وہ ماں سے بدتر، ہاتھ میں کڑا نہ پاؤں میں کڑا، بدن پر چاندی کا تار تک نہیں، چکٹ کرتہ، چوہا اوڑھنی، باپ کی صورت دیکھ کر لپکی۔ انعام نے گلے لگایا، اور گود میں لئے دالان میں آیا بیٹھا تو بیوی نے سارا قصہ سنایا کہ زندگی وبال، اور جان اجیرن ہے، دو دفعہ قرقیاں آچکی ہیں۔ ایک دفعہ بڑی مشکل سے دے دلا کر ٹال دیا تھا، دوسری دفعہ بڈھا خود ساتھ آیا اور جھاڑو تک لے گیا۔ مٹی کی ہنڈیا میں دو دو وقت کھچڑی پکا لیتی ہوں، بڑے میاں بھی چلے گئے، کوئی اتنا نہیں کہ دمڑی کی مرچیں بازار سے لا دے۔ بیوی کہہ چکیں تو میاں نے اپنا جھگڑا جھیڑا موقوفی کی خبر سن کر بیوی کو سناٹا آ گیا۔ اب تک یہ خیر تھی کہ روٹیوں کا دھندا چل رہا تھا۔ اب وہ بھی ختم ہوا، دس روپے کے قریب انعام کے پاس موجود تھے، بارہ تیرہ دن اس میں

ڈیر ہو گئے۔ مگر یہ صبح شام بھی جب وہ گھر کا سودا سلف اور گوشت ترکاری لینے کو جاتا تو دیکھنے والوں کے واسطے عبرت کا بہت بڑا سبق دے رہے تھے۔ وہی سودے والے کنجڑے، قصائی جو کبھی دُور سے سلام کو اُٹھتے تھے اب بات بھی نہ کرتے، اور یہ بد نصیب کھڑا اب کا منہ تکتا۔ یہاں تک بھی تعجب نہ تھا۔ ایک وقت وہ آیا جب دو مہینہ بعد سب کے دام چڑھ گئے اور انعام کا یہ عالم ہوا کہ کوئی گلی کوچہ و بازار ایسا نہ تھا جہاں سے وہ دن دہاڑے آسانی سے گزر جائے! چاروں طرف قرضخواہ موجود تھے کسی کا ایک تھا کسی کے دو اور کسی کے دس، کسی کے بیس۔

منھ چھپائے دن بھر پڑا رہنا، چھ سات مہینہ اس طرح بسر ہوئے آخر خود ہی انعام کو خیال آیا کہ مہینہ آنکھ بند کر کے گزر رہا ہے۔ آٹھ آنے روز کا مکان اب میری حیثیت سے زیادہ۔ آٹھ آنہ کا آٹا ہو تو تین آدمیوں کے چار وقت نکلیں۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ رہا نہیں خرچ جیتی جان کے ساتھ سب ہیں۔ کوئی کسی کا نہیں مکان دار کب تک خاموش رہے گا، اور واقعی رہنا، عدالت سے دو ہفتہ کی مہلت ملی مگر بڑی مصیبت یہ تھی کہ چپہ چپہ اور کونہ کونہ پر چیونٹیوں کی طرح قرض خواہ بھرے پڑے تھے۔ بڑی دقت اور خرابی تھی۔ ان ہی بڑے میاں کی عنایت سے جو حسن امام کی حمایت میں تشریف لائے تھے ڈھائی روپیہ کا ایک مکان جس میں ایک کوٹھڑی اور ایک دالان تھا کرایہ کو میسر آیا اور راتوں رات میاں بیوی بھاگ کر اس مکان میں جا پہنچے۔

چودھواں باب

انعام اور دھاجرہ کی زندگی کا یہ انتظام انسانی زندگی کا بدترین دور تھا۔ بیٹ کوٹکرا نہ تن کو چیتھڑا۔ مسلمانوں کا محلہ تھا۔ بڑے میاں میر محلہ، اُن کی بدولت فاقے نہ ہونے پاتے تھے۔ مگر ایک آدھ دفعہ نہیں بارہا ایسا ہوا کہ چار برس کی بینا کو مٹھی بھر چنے بھی نصیب نہ ہوئے۔ صبح شام ہو گئی اور شام صبح اگر انعام اپنی آبائی تمکنت پچھلی فضیلت اور گزشتہ عظمت کو بھول کر موجودہ حالت کا خیال کرتا دھاجرہ پرانی نخوت دیرینہ ثروت اور

اگلی شان و شوکت فراموش کر کے اس رعونت پر لعنت بھیج کر شرک و بدعت کے واقعات سے عبرت حاصل کرتی، تو بھی غنیمت تھا کچھ نہ کچھ ہو جاتا۔ دونوں میاں بیوی مل کر ایک نئی زندگی شروع کرتے۔ دنیا کا وسیع میدان آنکھ کے سامنے تھا، ہاتھ پاؤں سے کام لیتے امارت کو افسانہ، اور وجاہت کو خواب سمجھ کر اب جو آ پڑی تھی وہ سہتے، جو پڑی تھی وہ اٹھاتے۔ میاں۔ کری ڈھونا بیوی گوٹہ بنتی، روکھی کھاتے اور اُجلا پہنتے۔ بڑی چیز بھرم تھی۔ لاکھ زمانہ پلٹ چکا، اور بات بگڑ چکی تھی۔ لیکن ہمت سے کام لیتے تو سب کچھ تھا مگر سو مصیبتوں کی ایک مصیبت اور ہزار خرابیوں کی ایک خرابی وہ بل تھا جو رسی کے خاکستر ہونے پر بھی نہ جلا۔ رہنا جھونپڑے کا، مگر خواب محلوں کے۔ دس پندرہ روپے کی نوکری میاں کی کسرِ شان اور ایک آدھ روپیہ کا کرتہ بیوی کو وبالِ جان تھا۔ بڑے میاں کی عنایت تھی یا احسان کہ دس روپیہ مہینہ دے رہے تھے اور اسی پر تینوں کا گزران تھا۔ میاں بیوی میں اختلاف تو کبھی کا شروع ہو چکا تھا، اب ہر وقت کی فضیحتی تھی۔ بچی صبح ہی بڑے میاں کے ہاں چلی جاتی تھی، ماں باپ کی اس کل کل پٹ پٹ اور جوتی بیزار سے وہ بھی بیزار ہو گئی۔ کبھی رات کو بھی وہیں پڑ رہتی ہم اس کو غنیمت سمجھتے ہیں کہ اپنی اپنی جگہ اب دونوں نادم تو نہیں مگر متاسف ضرور تھے۔ ھاجرہ نے کبھی زبان سے تو کہا نہیں، مگر ہاں جب ٹوٹے ہوئے جھلنگے پر پڑتی تو رسموں کے خوفناک اژدہے عالمِ خیال میں چاروں طرف ڈستے اور جاڑوں میں سکڑ کر لیٹتی تو جہالت کے سپنولیے اور بچھو لبا طِ حیات کے ایک ایک چپہ پر ڈنک مارتے۔ یہ وہ وقت تھا کہ دونوں کی ساری ساری راتیں ان ہی الجھنوں میں ختم ہو جاتیں۔ الغام پہلے ہی فاق ہو چکا تھا۔ اب ھاجرہ بھی کھچی کھچی ہونی شروع ہوئی۔ عزیز و اقارب اوّل تو تھے ہی نہیں اور جو دو ایک تھے بھی وہ ان گنوں سے کنارے ہو گئے، ہاں ایک بڑے میاں رشتہ کی ساری کائنات موجود تھے، اور حق یہ ہے کہ وہ اپنے دم سے ہر طرح حاضر تھے۔ ہاتھ سے، پاؤں سے، روپیہ سے، پیسے سے، کھانے سے، ا

کپڑے سے کسی طرح بھی باہر نہ تھے، محلہ کیا شار اشہر اُن کی عزت کرتا تھا۔ اگر آدھی بات کو کوئی بات زبان سے نکال دیں تو ٹل نہ سکتی تھی۔ انعام کے لئے ہزار پانسو کا انتظام ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا مگر وقت کے منتظر اور موقع کے متلاشی تھے حسنِ اتفاق دولت آباد کے شہرۂ آفاق رئیس اُن سے ملنے آئے بڑے میاں نے انعام سے بھی ملایا، اور اس کی داستانِ مصیبت سنائی۔ اِس وقت تو بات آئی گئی ہوئی، مگر دوسرے دن علی الصباح رئیس نے خود ایک ہزار روپیہ انعام کی نذر کر دیا۔ مناسب یہ تھا کہ سب روپیہ لے جاکر بڑے میاں کے سپرد کر دیتا، مگر ظالم نے خبر تک نہ کی اور بیوی کے حوالہ کر دیا بڑے میاں کی تقدیر میں اپنی بات کے ضائع ہونے کا افسوس لکھا تھا وہ پورا ہوا، روپیہ ہاتھ میں آتے ہی ہاجرہ کی باچھیں کھل گئیں۔ چاہیئے تھا کہ اس روپیہ سے بدنصیب کوئی کام شروع کر دیتا یا تجارت، لاحول ولاقوت! ڈیڑھ دو مہینے تک خوب اللّے تللّے ہوئے، اب وہ جھک جھک اور رادورنا اتفاق ختم ہو چکی تھی۔ سلوک تھا، محبت تھی، جو میاں کی خواہش وہ بیوی کی مرضی جو بیوی کی مرضی وہ میاں کی صلاح، ایک دن بیوی نے کہا:۔

"یہ روپیہ تو اللہ نے ناصرہ کی تقدیر کا دیا ہے، ہماری تقدیریں تو پھوٹ چکی ہیں امیری فقیری تو اللہ کی دین ہے۔ وہ دن بھی گزرے یہ بھی گزر رہے ہیں۔ نہ وہ رہے نہ یہ رہیں گے۔ اللہ کا شکر ہے، جس حال میں رکھے، اس کا احسان، مگر میں یہ کہتی ہوں کہ بچی کے دو بول بسم اللہ کے ہو جائیں تو اچھا ہے۔ دیکھ لو دانتوں پکڑے ایک ایک پیسہ اٹھ رہا ہے پھر بھی تین سو سے اوپر اُٹھ چکے ہیں۔ اپنے کاموں میں تو آئیں گے ہی، ایک کام تو اس کا بھی ہو جائے جس نے اپنی رحمت کی۔ اس کے ہاں کیا کمی ہے، ایک اُٹھاؤ دہ در دنیا، ستر در عاقبت"

میاں:۔ میں تو اس وقت اس فکر میں ہوں کہ کوئی ایسی صورت ہو جائے جو پانچ سات روپیہ کی مستقل آمدنی ہو، تم کہتی ہو تین سو اٹھ چکے! مگر تمہارا ہی کیا قصور ہے سو روپیہ کا تو

فقط کپڑا ہی لایا تھا، ان شادیوں نے یہ دِن دکھایا! اب پھر وہی سوجھی، سب سے پہلے تو پھوپا جان ہی کو خبر ہوگی وہ نہ پوچھیں گے کہ یہ روپیہ کہاں سے آیا؟"

بیوی:- "اُن کا فکر نہ کرو، میں نے ترکیب سوچ لی ہے کہدوں گی "اماں کر رہی ہیں" بلکہ اُن ہی کے ہاں سہی۔ فکر کی جو کہو تو ایک فکر کئے سے کیا ہوگیا، جواب ہوگا، فکر تو تقدیر کا ہے ہی۔ گھڑی بھر تو خوش بھی ہولیں۔"

پندرھواں باب

بیوی کی یہ تجویز کہ بسم اللہ میکے میں ہو بہت پسند آئی۔ پھوپا صاحب کی شرکت تو درکنار خبر تک نہ کی، اور دونو میاں بیوی گھر کو قفل لگا، بچی کو لے چلتے ہوئے۔ اماں جان کو اس تجویز سے کب اِنکار ہوسکتا تھا، بیج تو ان ہی کے بوئے ہوئے تھے۔ جھپا جھپ تیاریاں شروع کردیں، لُطف یہ کہ مُصیبت میں کوئی بات تک کرنے والا نہ تھا، ضیافت میں سینکڑوں رشتہ دار آموجود ہوئے۔ پاؤ سیر بالوشاہی تانبے کی طشتری ایک رومال مفت کا۔ مال کیا بُرا تھا۔ عورتوں اور مردوں کے ٹھٹ لگ گئے، اور رات بھر کی خوب گہما گہمی ہوئی، وہی بی ہاجرہ جو کل تک فاقے مر رہی تھیں، آج دلہن کی اماں کے نام سے نہال ہو رہی تھیں۔ کیا تو کل کے لوگ تھے، کوڑی کوڑی دام دام، خرچ کر ڈالا، اور تیسرے روز شام کے وقت اپنے گھر میں آوارد ہوئے، بڑے میاں ایسے کیا بچے تھے سُن لی اور خاموش ہوگئے، جان گئے اور اُف نہ کی۔ خبر لگ گئی مگر زبان تک نہ لائے، ناصرہ کی شادی کسی بڈھے ٹھڈے کی موت تو بھتی ہی نہیں کہ ٹھا دبا بو چلے آئے ماشاءاللہ آدھے سے زیادہ شہر مدعو تھا قرضخواہوں کو بھنک کیوں نہ لگتا، وہ بھی آموجود ہوئے۔ الغا بسم اللہ میں مگن تھے آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ ان کے کلیجے میں لگ رہی تھی۔ رتی رتی بھانپ گئے، اور جاتے ہی گرفتاری کی درخواست دائر اور طلبانہ داخل کردیا۔ ناظر بڑے میاں کا مرید تھا، شام ہی کو حاضر ہو ساری کتھا کہہ سُنائی اور یہ بھی کہہ دیا کہ "میں نے اپنی کرنے میں کسر نہیں کی خبر کرنا میرا کام تھا، اب آپ جانیں یا وہ

وہ سب بچھڑے ہوئے ہیں۔ شادی کا رنگ انھوں نے دیکھ لیا، روپیہ کا پتہ اُن کو لگ گیا۔" بڑے میاں جواب کیا دیتے، ٹھنڈا سانس بھر کر خاموش ہو گئے انعام کو بلا کر صرف اتنا کہا۔ "بیٹا رات بیچ میں ہے، کچھ کر سکتے ہو تو کر لو، صبح ہی کارروائی شروع ہو جائے گی۔" میاں نے آکر بیوی سے کہا اور کچھ صلاح ہو کر یہ رائے قرار پائی کہ گرفتاری تمام شہر میں خواری کردے گی، دیس چوری پردیس بھیک، وطن کو خیرباد کہو اور جدھر منہ اٹھے چلے چلو۔ آٹے کی گٹھری دال کی پوٹلی، کپڑوں کی بقچی، بھکنی، دست پناہ، کونڈا، رکابی، ساتھ لیا، اور تینوں کے تینوں وطن کے درو دیوار کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے فصیل سے باہر نکلے، ھاجرہ جو گھر میں بھی اُٹھتے بیٹھتے الکساتی تھی، پورے دن منہ اٹھائے چلی جا رہی تھی۔ موسم سرد تھا جاڑا پورے زوروں پر جنگل کی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اس ڈراؤنی رات میں اپنے مہمانوں کی مدارات کر رہے تھے۔ انعام مرد اور ناصرہ بچی تھی، مگر بڑی مصیبت بدنصیب ھاجرہ کی تھی، سر پر گٹھری، ہاتھ میں پوٹلی، پیٹ میں بچہ، جان اجیرن اور ایک قدم وبال تھا۔ بگڑ گھسٹتی گھسٹاتی چلی جا رہی تھی جس کمبخت نے گلی میں بھی قدم نہ رکھا آج ببول کے کانٹے اور جنگل کے گوکھرو اس کے پاؤں لہولہان کر رہے تھے۔ تھوڑی دور چل کر دم لینے بیٹھ جاتی، اور پھر یہ سمجھ کر کہ راتوں رات جتنی دور نکل جائیں اچھا ہے چلنے لگتی، رات آدھی کے قریب اس طرح گذری۔ یہ وہ وقت تھا کہ کائنات کی ہر زندہ مخلوق قدرت کے زبردست قانون نیند کو پورا کر رہی تھی۔ پرندے اپنے آشیانوں میں دبکے سکڑے، درندے اپنے بھٹوں میں پاؤں پھیلائے، خانماں برباد چرند درختوں کے نیچے پڑے تھے، ہاں اس نعمت سے محروم تھے تو یہ تین خانہ بدوش انسان، جو ہتھیلی پر اپنی جان لئے دامن کوہ کی منزلیں طے کر رہے تھے۔ تاروں بھرے آسمان نے اُن کی بدنصیبی پر قہقہہ لگایا، درختوں نے جھوم جھوم کر اُن کی مصیبت پر ٹھٹے اڑائے۔ ہوا ان کا تماشہ دیکھنے آگے بڑھی۔ رات نے بستر کائنات پر کروٹ لی، مغرب سے سیاہ گھٹا نمودار ہوئی۔ اور آناً فاناً ابر سیاہ سروں پر چھا گیا۔

گرج کی خوفناک آوازوں نے ھاجرہ کا کلیجہ دہلا دیا۔ بجلی کی چمک آنکھوں میں گھسی جاتی تھی، اور تینوں ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے درختوں کے نیچے کلمہ پڑھ رہے تھے۔ موسلا دھار پانی برسنا شروع ہوا اور خلقت بپا یا نی نے اپنی فریادیں بلند کیں۔ گیدڑ چیخے، لومڑیاں چلائیں۔ ان آوازوں نے رہے سہے ہوش اور بگاڑ دیے۔ کبھی کبھی کچھ فاصلہ پر چیتوں کی دھاڑ اور سانپوں کی پھنکار بھی کانوں میں گونج جاتی تھی۔ جنگلی چوہے اور خرگوش سائیں سائیں کرتے ہوئے پاس سے نکل جاتے، رات اپنی منزل طے کر رہی تھی اور جنگل کی سرزمین پر حکومت کرنے والی مخلوق جس کا ڈنکا چاروں طرف بج رہا تھا، اپنے ناخواندہ مہمانوں کی روح سلب کر رہی تھی۔ بہ ظاہر یہ تینوں خاموش تھے مگر خون خشک ہو چکا تھا جان نکل رہی تھی اور دم پر بنی ہوئی تھی۔ انعام ناصرہ کو کلیجہ سے لگائے ھاجرہ کا ہاتھ پکڑے آنکھیں بند کئے خاموش بیٹھا دل ہوا ہو رہا، اور کلیجہ بلیوں اچھل رہا تھا بیبیں کے بیٹے اس کی حالت پر رو رہے تھے کہ دفعتاً ھاجرہ کی یہ آواز اس کے کان میں پہنچی "کہاں تک ضبط کروں درد نے میری جان پر بنا دی، یہاں دائی بھی میسر نہ ہوگی" اس عالم تنہائی و بے بسی میں جہاں آدمی نہ آدم زاد بیوی کی یہ صدا انتہائے مصائب کا وہ یقین تھا جس نے انعام کا دماغ مختل کر دیا! گھبرا کر اٹھا اور اسی اندھیرے میں اس توقع پر آگے بڑھا کہ کہیں ٹوٹی پھوٹی عمارت نظر آ جائے تو بیوی کو لا کر لٹا دوں، بادل بدستور گرج رہا تھا، مینہ ہلکا تھا، مگر بجلی تھم چکی تھی۔ ہر طرف نگاہ دوڑائی لیکن اندھیرے گھپ کے سوا کوئی چیز نظر نہ آئی۔ ارادہ کیا کہ آگے بڑھوں مگر پھر خیال آیا کہ ایسا نہ ہو مکان کی تلاش میں بچھڑ جاؤں۔ لوٹا قدم اٹھاتا کہیں تھا پڑتا کہیں، قریب پہنچا تو بیوی کی ایک چیخ آسمان اور ایک زمین تھی۔ درد کے متواتر دورے بڑے زور شور سے ہو رہے تھے مگر بچہ کسی عنوان نہ ہوتا تھا۔ جب تکلیف حد سے زیادہ گذری تو ھاجرہ بیہوش ہو گئی اس کی بیہوشی نے انعام کو قطعاً مردہ کر دیا۔ قریب آیا، نبض دیکھی تو کمزور، سانس برائے

نام سمجھا کہ بیوی اور چند لمحہ کی مہمان ہے۔ اُس وقت کی تصویر آنکھ کے سامنے پھر گئی جب ھاجرہ دُلہن بنی بیٹھی تھی، آرسی مصحف ہو رہا تھا، نظر اُس کے چہرہ پر سب سے پہلے پڑی اور آنکھ نے گھونگٹ میں آیندہ کے بہت سے وعدے کئے۔ یہ خیال آتے ہی کلیجہ پر اور ایک گھونسا لگا، اور دل نے صدا دی کہ جو میکے سے زیور میں لدی اور عطر میں بسی پالکی سے گھر میں داخل ہوئی تھی وہ آج میرے گھر سے اپنے اصلی گھر اس طرح سدھار رہی ہے کہ آسمان اس کی چھت ہے، درخت اِس کے براتی، مینہ کے قطرے اُس کا زیور، اور ہیپ کے پتے اُس کا لباس! اوپر نگاہ اٹھائی تو پہاڑ کی سر بفلک چوٹیاں خاتمۂ شب کی اطلاع دے رہی تھی، چڑیوں نے روز روشن کے استقبال میں نغمۂ مسرت شروع کر دیا، اور موذن کی اذان کے ساتھ ہی ایک ہی تھکے انسان کی وہ صدا جو پردۂ دنیا میں پہلی تھی انعام کے کان میں پہنچی۔ اذان کی طرف چلا تو ایک مسجد نظر آئی جہاں دو تین مسلمان موجود تھے۔ رو کر اپنی داستانِ مصیبت بیان کی تو ان لوگوں نے ایک گاڑی دی جس میں بیہوش زچہ اور نوزائیدہ بچہ کو لٹا کر گھر لایا۔ بڑے میاں کو خبر ہوئی رات کی واردات سُن کر روئے چپکے اُٹھ باہر گئے حکیم کو بلا نبض دکھائی۔ بخار تیز تھا، اور بخار والی بے خبر حکیم نے نسخہ لکھا اور کہا "دائی انگھڑ تھی آنول کا ریزہ پیٹ میں رہ گیا"۔ بچہ دس گیارہ گھنٹے دُنیا کی ہوا کھا کر رخصت ہوا، مگر اس کی یادگار ما ایسی پڑی کہ الٰہی توبہ! شام کے وقت ذرا ہشیار ہوئی تو ماں نے کہا "بیٹی خدا کے واسطے ذرا تو آنکھ کھولو، سارے گھر کی ست ہی ست پر جان ہے، بچی الگ سر پھوڑ رہی ہے، میاں جُدا ٹکریں مار رہے ہیں، اور میری آنکھوں میں تو دنیا اندھیر ہے۔ اس وقت تو خدا کا شکر ہے بخار بھی ہلکا معلوم ہوتا ہے۔ دوا صبح سے پڑی جھک مار رہی ہے، لو اب تو پی لو۔"

ہاجرہ "لاؤ دے دو۔"

ھاجرہ کی آواز سُنکر ماں کی جان میں جان آگئی، اِدھر سے ناصرہ اُدھر سے

انعام دونوں آکر بیٹھے۔ انعام نے بیوی کے افاقہ پر خدا کا شکر ادا کیا، ناصرہ پاؤں دبانے لگی۔ ماں نے دوا لاکر پلائی۔ پان کی کرچی دی۔ اب رات ہو چکی تھی بخار کم تھا، مگر نقاہت کا یہ حال تھا کہ بات اچھی طرح نہ ہو سکتی تھی۔ ہوش و حواس درست تھے، مگر ایک دن کا بخار نہ معلوم کیسا زہریلا اور قاتل تھا کہ مُردوں سے بدتر صورت ہو گئی۔ دس بجے کے بعد جب بچی سو گئی اور ماں کی بھی آنکھ لگ گئی تو انعام نے کہا "بھوپا نے چلتے وقت دس روپے دیئے تھے وہ اُٹھ رہے ہیں، بیماری کا گھر، زچہ خانہ کا خرچ، پانچ تو آج ہی اُٹھ گئے، کوئی اتنا نہیں کہ وقت پر دس بیس روپیہ ہی قرض دیدے۔"

بیوی "کوئی کسی کے کام نہیں آتا، اور دینے کو بازار اس کا جو لے کے دے، ہم نے دیا کس کا جو آج کسی سے مانگنے کا منہ ہو، ہاتھ سچا ہونا تو کیا بڑی بات تھی۔ مگر اس لائق ہی نہ رہے۔"

میاں "خیر خدا مالک ہے، خدا نے تمہارا دم بچا لیا۔ اس کا ہزار ہزار احسان روپیہ تو آنی جانی چیز ہے۔"

بیوی "خدا تمہارے منہ کا کہا کرے، مگر میری حالت اچھی نہیں ہے بُری طرح پڑی ہوں، خدا ہی ہے جو اُٹھوں۔"

حکیم کا علاج بدستور رہا، تین دن اور تین رات اسی طرح گزرے۔ کبھی اُمید سب کے چہرے نہال نہال اور کبھی اندیشہ تینوں چاروں دل مضمحل کر دیتا تھا۔ ناصرہ کلیجے کا ٹکڑا اور پیٹ کی اولاد تھی، بچی بھی پریشان ہوتی، مگر انعام کا حال بھی کچھ اچھا نہ تھا وہ اپنا فرض اور مرض سب بھول گیا۔ ساس کے اصرار اور بچی کے پیار سے مجبور ہو کر ایک آدھ نوالہ کھا لیتا ورنہ دنیا اس کی آنکھوں میں اندھیر تھی۔ چوتھے روز ہاجرہ صبح کے وقت اُٹھ کر بیٹھی اور بچی سے کہا:۔

سولھواں باب

"ناصرہ پیاری! خدا تمہاری عمر دراز کرے، اور یہ زندگی جو میرے لئے مصیبت تھی۔ تمہارے واسطے جنت ہو۔ کل کی بات ہے کہ میں اس دنیا میں بیٹی بنی اور جب وہ زمانہ آنکھ بند کرکے گزر گیا تو میری پیدائش سے جو قدرت کا اصلی مقصد تھا، اُس کے پورا ہونے کی وقت آیا یعنی دُنیا نے مجھ کو ایک گھر کی گھر والی، ایک شوہر کی بیوی اور انسانی دنیا کا ایک رکن بنا دیا۔ اس وقت میری نامراد زندگی کو دو کام انجام دینے تھے، دو فرض میرے ذمے، دو ضرورتیں میرے سامنے، دو گھر مجھ کو سنوارنے اور دو کسوٹیوں پر مجھ کو پورا اترنا تھا۔ یہ دونوں منزلیں دُنیا اور دین کے نام سے میرے روبرو تھیں۔ میرے پاک مذہب اسلام نے اس اذان کے ذریعہ سے جو موذن نے پیدائش کے وقت میرے کان میں کہی، مجھکو وہ پیام پہنچا دیا تھا جس کے پورا ہونے کا وقت یہ ہے، اب اس ابتدا کی انتہا، اس دُعا کا انجام اور اس اذان کی نماز ہے۔ مگر اذان دینے والوں نے ہنس ہنس کر سُنی، نماز والے رو رو کر پڑھیں گے، لیکن جس طرح ہنسنے والوں کے ٹھٹھے ختم ہوگئے اسی طرح رونے والوں کی آنکھیں خشک ہوگئیں، مگر رونا میرا ہے، روتی آئی روتی رہی اور روتی جاتی ہوں، دونوں کام چوپٹ، دونوں زندگیاں برباد، دونوں فرض ناقص اور دونوں گھر اجاڑ دئے۔ ہائے ناصرہ! خسر الدنیا والآخرہ زندگی کا یہ دَور عارضی تھا، مسرت کے جلوے فانی، دولت کا فریب سراب، اور خوشیوں کی جھڑیاں، ساون کی چڑیاں، جوانی کی صبح دوپہر تک پہنچکر ڈھلنے والی تھی اور شمع زندگی رات کے آخری حصّہ میں ٹمٹمانے والی، تمہاری جان سے دُور رہلوٹنی کے بچے نے جو بظاہر مقصد زندگی مگر درحقیقت چمنستان شباب کی مرجھانے کی اطلاع تھی، اس دور کا بھی خاتمہ کیا اور حقوق اللہ اور حقوق العباد کے ساتھ پرورش اولاد کا بار بھی سر پر رکھ دیا۔ مگر وہ وقت بھی رہنے والا اور سماں ٹکنے والا نہ تھا۔ اس رات کی سحر ہوئی اور وہ صحبت

درہم برہم۔ بیٹی پیاری! اب اس خواب کی تعبیر اور اس دوا کی تاثیر کا وقت ہے جو ہمیشہ دیکھا
اور عمر بھر پی۔ آج کوئی انسانی طاقت اور زبردست سے زبردست قوت ایسی نہیں جو
قدرت کے اٹل قانون کو شکست دیدے، جو بیج بو چکی اُس کے پھل لازمی، اور جو کام
کر چکی اس کے نتیجے ضروری۔ اب کہ مدت پوری اور زمانہ ختم ہو گیا۔ نظر ڈالتی
ہوں اُن اعمال پر جو کرتی رہی۔ غور کرتی ہوں ان افعال پر جو ہوتے رہے،
تو ایک سیاہ پہاڑ موت کے سر پر قدم جمائے کھڑا ہے۔ ہائے پیاری ناصرہ
اِدھر کی رہی نہ اُدھر کی۔ ماں باپ مجھ سے ناخوش، بہن بھائی مجھ
سے بیزار، عزیز میرے شاکی، محلہ مجھ سے نالاں۔ میکے کے دن ایسے کٹے کہ خدا دشمن
کے بھی نہ کاٹے۔ سسرال پہنچی تو لاکھ کا گھر خاک اور بھرا پُرا گھر اُف کر دیا۔ چالیس برس کے
قیام میں کوئی کام ایسا نہ کیا جس پر فخر کروں کوئی آدمی ایسا نہیں جو خوش ہو۔ کوئی صبح
اور کوئی شام ایسی نہ گزری جس کے خیال سے تسکین اور کوئی دن رات ایسا نہ کٹا جس کی
یاد سے اطمینان میسر ہو۔ اب موت نے آدبایا، زندگی پر نادم اور کرتوتوں پر شرمندہ
ہوں۔ آنکھ کھُلی مگر بے وقت۔ پنیا رہوئی لیکن بے موقع، وقت نکل گیا بات جاتی رہی
رات ختم ہوئی، رونا بے سود، پچھتانا بیکار۔ ہاں میری زندگی دو مردوں کے لئے عبرت
اور بچوں کے لیے سبق ہوگی۔ گھر والیاں زندگی سے فائدہ اُٹھائیں گی، اور مائیں میرے
حالات سے پناہ مانگیں گی۔ خدا تم کو بڑا کرے جب اس قابل ہو جاؤ تو میرا یہ پیام میری
بہنوں تک پہنچا دینا۔ مجھ کو جس چیز نے دنیا اور دین دونوں میں برباد کیا وہ شادی اور
موت کی رسمیں تھیں۔ شرک اور قبر پرستی سونے پر سُہاگہ جس نے عمر بھر ذلیل و رسوا کیا۔
میں وہ کم بخت عورت ہوں جس کے معزز و متمول شوہر نے محض میری بدولت دَر دَر
بھیک مانگی۔ وہ نابکار بیوی ہوں جس نے سو روپے کے تنخواہ دار شوہر کی تمام
عزت و آبرو اپنی خواہشوں اور جہالت کی رسموں پر قربان کر دی۔ وہ ننگ خاندان

بیٹی جو پانچ ہزار کا جہیز لے کر میکے سے آئی، وہ منحوس و ناہنجار بہو جس کو سسرال نے پچیس ہزار کی جائداد عطا کی، لیکن میکے کا اثاثہ اور سسرال کا مال چلّے اور چالوں، عقیقے اور پھولوں پر لٹا دیا، جن الفتوں نے بریانیاں اڑائیں، جن شہدوں نے متنجن چکھے، جن مکّاروں نے بہاریں دیکھیں، جن دغابازوں نے نقدیاں اینٹھیں، آج ان میں سے ایک بھی موجود نہیں اور نہ وقت پر کام آنے والا نکلا۔ ڈٹ ڈٹ کر کھانے والے مصیبت کے وقت تماشہ دیکھنے والے، اور باڑ پر رکھ کر لوٹنے والے تکلیف کے موقعہ پر سیر دیکھنے والے تھے۔ جس گھر میں چار بلکہ پانچ پشتوں سے ایک ہی خاندان کے نال گڑتے چلے آتے تھے، جس مکان کے چپے چپے اور کونے کونے پر صدائے توحید بلند ہوتی تھی، آج اس تمام سرزمین پر غیروں کا راج ہے، اور سنکھ کی آواز گونج رہی ہے! میرے کوارپنے کا ذکر ہے ہمارے گھر میں جو نیم کا درخت ہے اس پر ایک فاختہ کا گھونسلا تھا، ایک دن دوپہر کے وقت ہم سب انگنائی میں بیٹھے تھے کہ نر اور مادہ دونوں خلاف معمول آکر بیٹھ گئے، ابا جان کی نظر پڑ گئی، تو انھوں نے فرمایا "پرند ہوا کو ہم سے زیادہ پہچانتے ہیں یقیناً بارش ہونے والی ہے۔" یہ بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ ہمارے سروں پر بادل کڑکنے لگا، اور ہلکی ہلکی بوندوں کے ساتھ چنے چنے برابر اولے پڑنے شروع ہوئے، جس طرح ہم اٹھ کر دالان میں چلے گئے اسی طرح وہ دونوں بھی اندر دبک گئے۔ اولوں کی باڑ زبردست تھی اور دونوں میاں بیوی کہنے کو تو جانور تھے، مگر گھونسلا نہ چھوڑا۔ اولے دھڑا دھڑ پڑ رہے تھے مگر بے زبان پرند جنبش نہ کرتے تھے۔ چار تنکوں کا گھونسلا حقیقت ہی کیا رکھتا تھا، ایک اولے نے اپنے ساتھ ہی سطح زمین پر پہنچا دیا۔ گھونسلا نہ رہا، اولے بند ہو گئے، بادل کھل گیا، مگر ان جانوروں نے وہ جگہ نہ چھوڑی کئی روز تک وہیں بیٹھے رہے۔ جانوروں کے دل میں گھونسلے کی محبت اتنی کچھ تھی، میری شادی سے کوئی چھ مہینے پہلے جب چھوٹی چچی جان نے اپنا مکان بیچا ہے اور وہاں سے

اُٹھی ہیں، حالانکہ حج کو جارہی تھیں تو رو تے رو تے بیہوش ہوگئیں۔ چوبیس برس کی بات ہے مگر مجھے آج تک یاد ہے جب لال ڈاڑھی والے مرزاجی ٹوپی والے پر کرایہ کا تقاضا کرتے تھے تو چھوٹی دادی جان سہم جاتی تھیں اور دُعا مانگتی تھیں کہ "الٰہی میری اولاد کرایہ کے مکان میں نہ رہے"۔ مگر میں وہ ناشدنی ہوں کہ سب دعائیں اور التجائیں خاک میں جھونک دیں۔ خدا نے ایک چھوڑ آٹھ دس مکان دئے مگر سب رسموں کی بھینٹ چڑھا دیئے"۔

سترھواں باب

ھاجرہ یہیں تک پہنچی تھی کہ دروازہ پر غُل غپاڑہ کی آواز سنائی دی، سب کے کان کھڑے ہو گئے، منتظر تھے کہ کیا شور ہے، جو انعام نے باآواز بلند کہا "پردہ کرو قرقی آگئی ہے"۔ تینوں سہم گئے۔ ھاجرہ اُٹھنے کے قابل نہ تھی، میلا سا چادرہ اوپر ڈال لیا، ماالبتہ ایک کونے میں کھڑی ہو گئیں۔ ناصرہ گم سُم چبوترہ تھی کہ اہلکار اور بلاّ انعام کو لئے اندر داخل ہوئے مصیبت کا وقت درد انگیز سماں تھا، دونوں عورتیں اور ایک بچی خاموش خدا کی قدرت دیکھ رہے تھے۔ ناصرہ تھر تھر کانپ رہی تھی، قرقی کے واسطے رکھا ہی کیا تھا جو دو ایک چیزیں پڑی تھیں وہ بلاّ نے اپنے قبضہ میں کیں کہ بلا سے خرچ تو نکلے۔ تانبے کے کچھ برتن، جہیز کا نواڑی پلنگ، دو تخت، ایک پاندان! یہ کل کائنات تھی، یوں تو تینوں چاروں کی جان پر بن رہی تھی، مگر بچی کی حالت بہت ابتر تھی۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے تھے کلیجہ دھک دھک کر رہا تھا۔ بے اوسانی میں اوڑھنی بھی کہیں گر پڑی، ایک کونہ میں چپکی کھڑی رو رہی تھی، اور کچھ پڑھ پڑھ کر پھونک رہی تھی، کہ خدا یہ مصیبت جلدی ٹالے۔ بلاّ کونہ کونہ ڈھونڈھ رہا تھا، اور جو چیز نظر آتی تھی اُٹھاتا جاتا تھا۔ بچی آخر بچہ ہی تو تھی اپنی گڑیوں کا خیال آیا۔ دوڑ کر بھاگی اور گڑیاں اُٹھا کر ہاتھ میں چھپالیں۔ بلاّ دُور سے کھڑا تاک رہا تھا سمجھا کہ لڑکی نے کوئی مال چھپایا چیل کی طرح جھپٹا اور اور کہا "دکھا کیا ہے؟" بچی سہم گئی ہاتھ دونوں کُرتے کے اندر کر لئے اور منت سے کہنے لگی "کچھ نہیں" کمبخت کیا ماننے والا تھا گھسیٹ کر

کر باہر لایا اور کہا "سیدھی طرح دکھاتی ہے تو دکھا نہیں تو زبردستی چھین لوں گا۔ پرایا مال مفت کا ہے لپ لپ اڑا لیا، شادیاں ہوں میزبانیاں ہوں دینے کی فکر خاک ہو" بچی کیا جواب دیتی، آنکھ سے زاروقطار آنسو بہ رہے تھے، اور یہ کہے جاتی تھی "میرے پاس کچھ نہیں ہے" بگڑ گیا اور زبردستی ہاتھ باہر گھسیٹ لئے۔ زور سے مٹھیاں کھولیں، تو بیچاری نے کہا "دیکھ لیجئے کچھ نہیں ہے میری گڑیاں ہیں، چاہے لے لیجئے" اب جو ملا نے نگاہ اوپر کی تو ناصرہ کے کان میں دو بالیاں چاندی کی جن پر سونے کا ملمع تھا دکھائی دیں، کہنے لگا "اتار دے" بالیوں کا نام سنتے ہی ناصرہ سہم گئی۔ سب سے پہلے اس نے باپ کی طرف دیکھا کہ وہ حمایت لے اور اس شکرے سے جو چڑیا کی طرح اس کو پنجہ میں پکڑے ہوئے ہے بچائے، مگر باپ کی نگاہ نیچی تھی، اس لئے ناصرہ کی نظر پلٹ کر حسرت سے ملا کے چہرے پر پڑی اور اس نے عاجزی سے کہا:۔

"اچھی میری بالیاں نہ لو"

سنگدل معصوم پر کیا رحم کھاتا، بالیاں اتارنے لگا، گونجیں سخت تھیں نہ کھلیں بچی برابر بلک رہی تھی، اور اس پتھر کے ہاتھ نہ رکتے تھے۔ گونجیں نہ کھلیں تو زور کیا، کان کی لبلبا ہی کیا تھی، لہو لہان ہو گئے، خون کی تلی بندھ گئی، مگر ملا کیا چھوڑنے والا تھا۔ کہا "یہی تو ایک چیز ہے جس سے تھوڑے بہت آنسو پچھیں گے" قینچی منگوا کر گونجیں کتریں اور دونوں بالیاں اینٹھ لیں۔

اٹھارھواں باب

احتمال یا اندیشہ ہو گا تو انعام کو ہم کو تو امید اور یقین تھا کہ سب سے پہلے تو ولادت اور ولادت کی مصیبت اور اس کے بعد یہ کیفیت اور کیفیت کی آفت دفعاجرہ کی تمام مصیبتوں کا خاتمہ کردے گی، اور اس طرح وہ کمبخت خود مر کر اور دوسرے اس کو گاڑ کر بہت سی مصیبتوں سے چھٹکارا پا جائیں گے، مگر برے کو موت کہاں! پندرہ بیس

روز تو بڑی رہی اور پھر پوٹ بوٹ خاصی اچھی طرح اُٹھ کھڑی ہوئی۔ کھٹیا کٹی تو موت دکھائی دی اور موت کے ساتھ خدا یاد آیا۔ سنبھل کر بیٹھی تو دُنیا نظر آئی اور دُنیا کے ساتھ زندگی کے لُطف، ہاں انعام کے دِل میں فرقی کا منظر ایسا گڑا کہ مرتے دم تک نہ نکلا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ یہ تمام خرابی تربیت کی ہے جس نے ھاجرہ کی طبیعت میں ایسے بیج بوئے۔ اب اس کو سب سے زیادہ فکر ناصرہ کا تھا اور یہ دیکھ کر اس کی روح اور بھی فنا ہوئی جاتی تھی کہ بیٹی کا جو رنگ تھا وہ ما کے ڈھنگ پر، بڑے میاں کی صحبت اس کے زنگ پر گو اچھا صیقل کر رہی تھی، مگر دودھ کا جلا چھاچھ کو پھونک پھونک کر پیتا ہے، جتنا وہ بڑھتی تھی اُتنا ہی اُس کا خون خشک ہوتا تھا۔ بیوی کے گُن اور اپنی بربادی پیشِ نظر تھی، بچی کی تربیت اور اس کا انجام آنکھ کے سامنے، خواہ مخواہ ڈانٹنا، بلا وجہ گھرکنا، کافر کہنا، جاہل کہنا، حد یہ ہے کہ اس نے ناصرہ کہنا چھوڑ دیا! سامنے موقع ہوتا اور پیٹھ پیچھے ذکر آتا تو اُس کی زبان سے جب نکلتا مشرکہ۔ ایک بڑے میاں تو البتہ ناصرہ کہتے ورنہ بڑا اور چھوٹا محلہ اور پڑوس جو کہتا وہ مشرکہ۔ عزیز اس رمز کی تہ کو کیا خاک اور ھاجرہ اس طنز کی پھٹکار کو کیا سمجھتی، چند ہی روز میں یہ کلمہ بھر میں مشہور ہو گیا۔ اصل میں یہ انعام کی پیش بندی کے جتن تھے، ورنہ بڑے میاں کی صحبت اور تربیت ناصرہ کو کُندن بنا رہی تھی، مگر انعام کے دل میں کچھ ایسا ڈر بیٹھا تھا کہ اس کو بچی کا کھانا پینا، اُٹھنا بیٹھنا، جو فعل تھا وہ شرک اور رسم ہی معلوم ہوتے تھے اب ذرا انعام کی آنکھیں کھُلیں اور اُس کا پہلا تغیر جو ظاہر ہوا وہ یہ تھا کہ روپیہ ہوتا یا پیسہ جو آتا اور جو ملتا وہ بیٹی کے ہاتھ میں دیتا۔ مشرکہ تھی تو بچی، دس گیارہ برس کی جان خانہ داری کے رگڑوں جھگڑوں کو کیا خاک سمجھتی، مگر خدا بھلا کرے بڑے میاں کا کہ مشرکہ کو گوڈر سے لعل، پتھر سے نیلم، اور ناصرہ سے بیگم بنا دیا۔ ما کی کمر کی چک، پاؤں کی موچ اور بھیجے کے درد کو بیٹھی نہ تھی۔ وہ اندھیرے منہ وضو کر، نماز پڑھ آٹا گوندھ روٹی پکا، کھانا تیار کر لاتی، بیٹی کا یہ

رنگ دیکھ کر ما پر تو کیا خاک اثر ہوتا مگر ہاں انعام کی جو آگ مدت سے دبی ہوئی تھی ابھری اور اس نے سوچا کہ اتنے عرصہ تک خدا سے فرنٹ رہا، اس نافرمانی کا نتیجہ جو کچھ بھگتنا تھا بھگت لیا، عزت برباد، نوکری غارت ہوئی، جائداد ٹھکانے لگی، زیور ختم ہوا، سب ترکیبیں کر ڈالیں۔ مگر قرضہ اترا نہ افلاس دور ہوا، اب بہتر صورت یہ ہے کہ سچے دل سے توبہ کروں، اور گناہوں کی معافی مانگوں، خدا کا خوف بچپن ہی سے دل میں بیٹھا ہوا تھا، کلیجہ سے آتش عذاب کے دھوئیں کا نکلنا تھا کہ ندامت نے اس پر تیل چھڑکا، نہایا پھٹے پرانے کپڑے اتار کر اجلے پہنے اور جو برسوں سے لغویات کے چکروں میں پھنسا ہوا تھا آج مدت بعد سجدے میں گرا سچے دل سے رویا، خشوع وخضوع سے معافی مانگی، بلبلا بلبلا کر التجا اور گڑ گڑا کر منتیں کیں، تین ہی وقت کی نماز پڑھنے پایا تھا، دوسرے روز صبح کو ادھر فجر کا سلام پھیرا، ادھر بڑے میاں "سلام علیک" کہہ کر اندر داخل ہوئے مشکور بیٹھی کلام اللہ پڑھ رہی تھی، اس کے سر پر ہاتھ پھیرا، اور انعام کو لیکر باہر آئے۔ ادھر ادھر کی باتیں کیں اور کہنے لگے "رئیس دولت آباد کے ہاں پچاس روپیہ ماہوار کی ایک آسامی خالی ہے کام کم ہے، اور تنخواہ معقول، رئیس اچھا ہے اور سلسلہ مناسب، شہر کے شہر میں رہنا کہیں آنا نہیں، پردیس کا کھٹکا نہ سفر کی زحمت، دو گھنٹہ کی محنت اور لمحہ بھر کی حاضری، میں نے معاملہ طے کر لیا ہے چلو آمنا سامنا کرا دوں۔ ابھی ساتھ چلے چلو، اور کام شروع کر دو۔"

انیسواں باب

انعام کی زندگی کے کارنامے یوں تو بڑے بڑے ہیں، مگر جس نے اس کی ڈوبتی ہوئی کشتی پار لگا دی، وہ صرف یہ اہتمام تھا کہ اس ملازمت کے بعد تنخواہ کا واسطہ بیوی سے نہ رکھا، مہینہ کے مہینہ تنخواہ اور اوپر کی آمدنی جو کچھ بھی ہوتی پیسہ پیسہ بیٹی کے ہاتھ میں لا کر دیدیتا، لڑکی دیکھنے میں تو بچہ تھی مگر اس خوش اسلوبی سے گھر چلایا کہ سارا کنبہ دنگ رہ گیا، ایک چھ ہی مہینہ میں گھر کی کایا پلٹ دی، بیوی کی کینچلی میاں کا ٹھاٹ سب بدل گئے جس گھر

حالت

بیں گوڑے کے تودے اور خاک کے انبار لگے رہتے تھے، اب وہاں دونوں وقت جھاڑو، دالان بیں دری اور کمرے میں چاندنی دکھائی دینے لگی، یا وہ کھانے کا ٹھیٹھ تھا کہ بارہ اور ایک بجے تک سارا گھر نہار منہ بیٹھا ہوا ہے، یا ادھر صبح آٹھ بجے کی توپ چلی ادھر مغرب کی اذان کے وقت کھانا بالکل تیار۔

یہی آمدنی تھی اور یہی خرچ، ناکے ہاتھ سو روپیہ آئے اور اکیلے دم پر ختم کر دیئے۔ اب پچاس میں تین آدمی، مکان کا کرایہ، قرضہ کی قسط، پھر بھی وقت بے وقت کے واسطے مشترکہ کچھ نہ کچھ لگا رکھتی، شاید پورا سال بھی نہ گزرا ہوگا کہ گرمی کے موسم میں ایک روز وہ عشاء کی نماز پڑھ رہی تھی کہ آندھی زور شور سے اُٹھی، آندھی کیا خدا کا قہر تھا کہ بڑے بڑے درخت اور سائبان اپنی جگہ سے اکھڑ گئے چاروں طرف سے دھڑ دھڑ کے سوا کوئی آواز نہ آتی تھی، ہاں مٹی اور خاک تھی کہ زبردستی منہ میں اور ہاتھ میں بدن میں اور مسامات میں گھسی جاتی تھی، اندھیر گھپ اور اس پر یہ مصیبت کلیجے دہل گئے۔ ھاجرہ نے پہلے تو آسمان کی طرف منہ کر کے تین دفعہ یہ کہکر پھونکا "آندھی بیوی کے دامن سے باندھی" مگر جب اس سے کام نہ چلا جھاڑو لا کر مشترکہ کو دی اور کہا "بیٹی تو کواری ہے، جلدی سے یہ جھاڑو سل کے نیچے دبا دے کہ آندھی اتر جائے۔" مشترکہ اِن توہمات سے ہزاروں کوس دُور تھی، ماں کا حکم انکار بھی نہ کر سکی، جھاڑو لے لی اور اچھا کہکر باورچی خانہ میں ڈال آئی۔ دالان میں کھڑی آسمان کو دیکھ رہی تھی کہ روشنی دکھائی دی متعجب ہوئی کھڑی رہی روشنی لمحہ بہ لمحہ تیز ہو رہی تھی یہاں تک کہ آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے، ڈر گئی اور سوچنے لگی کہ خبر نہیں کس بدنصیب پر مصیبت آئی، ساتھ ہی خیال آیا کہ یہ پھوپی جان کا گھر معلوم ہوتا ہے، تڑپ اُٹھی انعام دن بھر کا تھکا ہارا اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں کہ کیسی آندھی اور کس کی آگ مزے سے بڑا خراٹے لے رہا تھا کہ مشترکہ نے جا کر جگایا، گھبرا کر اٹھا اور کہنے لگا کیا ہے؟"

مشترکہ "ذرا اس روشنی کو دیکھئے، اس آندھی میں یہ کیا ہو رہا ہے؟"

انعام:۔ "یہ تو کہیں آگ لگی ہے اور بہت زور کی ہے۔"

مشرکہ:۔ "اندر گلی میں ہے۔ خدا کرے پھوپی جان خیریت سے ہوں۔"

انعام:۔ "مجھے بھی وہیں معلوم ہوتی ہے، کیونکہ یہ سائبان ان ہی کا ہے۔ خیر اب تم لیٹو صبح کو دیکھی جائے گی۔"

مشرکہ:۔ "آپ کو تکلیف تو ہوگی، مجھے نانا ابا کے یہاں پہنچا دیجئے، میں اُن سے پھوپی جان کی خیر صلاح منگواؤں گی۔"

ہاجرہ:۔ "بیٹی تو دیوانی ہوئی ہے اپنے سے خوب خدا، یہ باہر نکلنے کا وقت ہے؟ نوج اس آندھی میں کواری بیٹیاں باہر نکلیں، اسی میں تو جنوں کی سواری نکلتی ہے جس پر نظر پڑ گئی وہی گیا گزرا ہوا۔"

مشرکہ:۔ "میں تو کلام اللہ پڑھ رہی ہوں اور پڑھتی ہوئی جاؤنگی، مجھ پر کیا اثر ہوسکتا ہے۔"

انعام:۔ "تم گھبراؤ نہیں میں جاکر دیکھ آتا ہوں۔"

انعام دو تین قدم گیا ہوگا کہ گلی میں شور مچ رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ بہن بد نصیب کے ہاں آگ لگی ہوئی ہے۔ اُلٹے پاؤں لوٹ آیا، اور ایک کہی نہ دو چپکا اپنے بچھونے پر پڑ رہا۔ مشرکہ آخر تھی کس باپ کی بیٹی خاموش دیکھ کر خود تاڑ گئی۔ پوچھا نہ گچھا صرف اتنا کہا "ابا جان آیئے مجھ کو ذرا یہاں تک کر دیجئے۔" جبراً اور قہراً انعام ساتھ چلا مگر باہر نکلتے ہی مشرکہ بڑے میاں کا گھر چھوڑ پھوپی کی طرف بڑھ گئی، آگے آگے وہ اور پیچھے پیچھے باپ وہاں پہنچے تو میدان حشر برپا تھا۔ ماں بچوں کو ساتھ لئے علیحدہ کھڑی تھی اور گھر کا کل اثاثہ برتن، بھانڈا، ٹھڑی پٹڑا آنکھوں کے سامنے خاک سیاہ ہو رہا تھا۔ لوگ بھر بھر کے لوٹے اور لا لا کر گھڑے ڈال رہے تھے مگر پانی تیل کا کام کر رہا تھا، دو ہی تین گھنٹہ میں گھر کی چیز بست تو الگ رہی، چھت سے کڑی تختے کواڑ اور چوکھٹیں سب راکھ ہو گئیں۔ مشرکہ اس وقت تو چلی آئی، مگر رات آنکھوں میں کاٹ دی، صبح اُٹھتے ہی نماز سے فارغ ہو، جھاڑو بہارو دے دلا چٹکی بجاتے روٹی ڈال گھڑ کی میں سے بڑے میاں

کے ہاں اور ان کو ساتھ لے پھوپی پاس بیوہ تو نہ تھیں، مگر زندہ میاں مُردے سے بدتر تھے، اپاہج نہیں، بیمار نہیں، معذور نہیں، مجبور نہیں، تھے ہٹے کٹے موٹے تازے، مگر بھلے مانس نے عمر بھر پیسہ کمایا ہی نہیں۔ دن بھر میلے کچیلے کپڑے پہنے، اِدھر لیٹا، اُدھر لیٹا، کبھی سو گیا کبھی اُٹھ بیٹھا، شام ہوئی اور کوٹ پتلون ڈانٹ کالر ٹائی لگا، لکڑی ہاتھ میں، رومال جیب میں سیر کو نکل کھڑا ہوا۔ ایک بیوی ہی کیا سارا کنبہ اور محلہ بے غیرت کو برا بھلا کہتا، لڑکپن جوانی سے اور جوانی بڑھاپے سے بدل گئی، مگر اس کے ڈھنگ نہ بدلے، آٹھ سات روپیہ کا کرایہ تھا دس روپیہ مہینہ بیوی کے میکے سے آتا، اسی میں لستم پشتم گزر ہو جاتی تھی، بڑے میاں لباس میں تو انگریز اور دیکھنے میں صاحب بہادر تھے، مگر خصلت میں اور عادت میں نکھٹو بلکہ بد سے بدتر ایک دن دوپہر کے وقت، اب سے کوئی پندرہ برس پہلے، بیٹھے حقہ پی رہے تھے کہ ایک فقیر نے صدا دی اور بآوازِ بلند کہا "اس گھر پر مصیبت آنے والی ہے، اِدھر آ" صاحب بہادر آئے تو منڈ چڑے فقیر نے کڑک کر کہا "تین مہینے کے اندر برباد ہو جائے گا، ابراہیم کی خیر نہیں، گھر سے جنازہ نکلے۔ ناگہانی موت آئے، ایک کفن سر سے باندھ اور سوا روپیہ نقد دے آگے تو جان" صاحب بہادر کے سنتے ہی ہوش اُڑ گئے، فقیر کو ٹھہرا اندر آئے اور بیوی سے کہا "وہ جو گھی کا روپیہ رکھا ہے اس کو دیدو، اللہ خیر رکھے بڑے کا نام صاف لے رہا ہے کہ ابراہیم کی خیر نہیں۔

بیوی:- "ایسے ایسے فقیر بہت سے دیکھے ہیں، ایسے غیب داں ہوتے تو در در بھیک نہ مانگتے"

میاں:- "دیکھو پھر پچتاؤ گی ایک روپیہ بڑی چیز نہیں ہے فقیر پہنچا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ آج تک اس کی صورت اس محلہ میں نہیں دیکھی"

بیوی:- "معاف کرو میں ایسے جھکموں میں آنے والی نہیں"

فقیر (بآوازِ بلند) "اچھا بابا جاتے ہیں یاد رکھ بھول مت"

بڑے میاں نوٹ منتر کرکے پھوپی کے پاس چھوڑ افسوس کرتے ہوئے چلے آئے۔

وہ بیٹھی تسکین دے رہی تھی کہ پھوپا صاحب بہادر بولے "بیٹی تقدیر کا لکھا پورا ہوا، ہاتھ کل

گئے نہیں، تو کوئی پندرہ روز کا ذکر ہے کہ ایک بزرگ صاحب کہہ گئے تھے کہ تین مہینے کے اندر مصیبت آنے والی ہے، کچھ زیادہ نہیں سوا روپیہ مانگ رہے تھے، تمہاری پھوپی نے نہ دیا دیتیں کہاں سے اور نکلتا کیونکر مقدّر میں تو یہ تباہی لکھی تھی۔"

مشترکہ" تو کیا وہ غیب داں تھے؟"

پھوپھا:- "غیب داں کیا اللہ والے تھے۔ ہم جیسے دنیا کے کتّوں سے ہزار درجہ افضل"

بیوی:- "اب یہ وقت بحث کا تو نہیں ہے اللہ بچہ کی جان بچالے، خبر نہیں کس طرح جوڑ جکڑ بچی کے دو کپڑے کئے تھے ہاتھ جھاڑ کر بیٹھی، چیتھڑا تک نہ رہا، دو چار برتن رہ گئے تھے وہ بھی نہ رہے۔"

میاں:- "میں تو یہی کہوں گا اگر سوا روپیہ دے دیتیں، تو کچھ بھی نہ تھا۔ تم نے جان بوجھ کر آگ لگوائی۔"

بیوی:- "خدا کے واسطے چپکے رہو، کیوں جلی کو جلاتے ہو؟"

میاں:- "اچھا اب اس بچے کا تو کچھ فکر کرو ہسپتال بھیجتی ہو؟ حکیم کو دکھاتی ہو؟"

بیوی:- "میرے پاس کیا رکھا ہے جو ڈاکٹر کے ہاں بھیجوں یا حکیم کے ہاں۔ دو روپیہ صندوقچی میں تھے وہ گئے گزرے ہوئے۔"

آگ لگنے کی واردات **اس طرح** پیش آئی کہ نکھٹو صاحب بہادر بیوی کے چیخنے پیٹنے کہنے سننے سے نوکری کی تلاش اور فکر معاش میں اِدھر اُدھر علی الصباح نکل جاتے تھے۔ فقیروں کے معتقد تھے۔ یہ سلسلہ بھی موجود تھا۔ کسی بزرگ نے دس روپیہ اینٹھ کر چراغ پر نقش لکھ دیا تھا کہ اس کو جلاؤ، اور اتنا خیال رکھو کہ نظر اس پر سے ہٹنے نہ پائے گرمی کے دن تھے، بدنصیب اندر کے دالان میں چارپائی پر سویا، اور سامنے طاق میں چراغ رکھا۔ پہلونٹی کا بچہ ابراہیم زیادہ ہلا ہوا تھا۔ بھنیرا اماں نے بہلایا، مگر نہ مانا اور باپ ہی سے لپٹ کر گھس میں سویا۔ ماں کی غفلت تھی، اور باپ کی عنایت کہ چراغ بچے کے سرہانے تھا، پھول جھڑا۔

اور جھبراہرا بر کے صندوق پر چیر کی لکڑی، گرمی کے دن، دم بھر میں تو آگ کہیں کی کہیں تھی۔ شعلوں نے بچے کے بال اور کنپٹی جھلس دی، تو باپ کی آنکھ کھلی، گھبرا کر اٹھے، بچہ کو گود میں لیا سٹ پٹا کر بھاگے، نیند اس بلا کی تھی کہ بچہ بلکتا رہا، اور بادا جان چادر تانے پڑ کر سو گئے کہیں آدھی رات کے قریب جب آندھی نے قیامت ڈھائی، دونوں میاں بیوی کی آنکھ کھلی، بچہ روتے روتے بے ہوش ہو گیا تھا پانچ ساڑھے پانچ سال کا بچہ بدنصیب کو خاک خبر نہ ہوئی، کہ ماں کے ساتھ ماما پر بھی چھری چل گئی۔ صبح ہو چکی تھی کہ ماں کی نگاہ بچہ کے چہرے پر پڑی۔ تڑپ گئی چمکارا، ہشیار کیا، گود میں لیا۔ دیکھتی ہے تو ایک آنکھ اور کنپٹی کا حصہ کالا بھبوکا بچہ گود میں تھا، کہ مشر کہ پہنچی اور بزرگ نے یہ گفتگو شروع کی۔ فقیر اور بزرگ کا نام سُن کر آگ لگ گئی۔ میاں نے جب کو را جواب سُن لیا، گردن نیچی کر خاموش ہو گئے۔ کوئی دو لمحہ بھی نہ گزرے ہوں گے کہ کان میں یہ آواز آئی۔

"دے دے جب نہ دیا اب دے۔"

میاں:۔ "دیکھو یہ وہی میاں صاحب ہیں جو پہلے سے خبر دے گئے تھے۔"

بیوی:۔ "اسی بے ایمان نے آگ لگائی ہے کوئی سمجھدار آدمی ہو تو ابھی گرفتار کرا دے۔ اب اپنا رعب بٹھانے آیا ہے۔"

میاں:۔ "خدا کے واسطے زبان بند کرو یہ کچھ تو کر چکیں، دیکھئے اور کیا کرنا ہے تمہارے ان بڑے بولوں سے مجھے بچہ کا ڈر لگ رہا ہے۔"

بیوی:۔ "موت اور زندگی خدا کے ہاتھ میں ہے یہ پیر اور فقیر سب ڈھکوسلے ہیں۔

فقیر:۔ دے دے، جب نہ دیا اب دے (کڑک کر) یاد رکھ، بھول مت دے، دے، جب نہ دیا اب نہ دے۔

میاں:۔ "خدا سے کیوں بھڑتی ہو۔ وہ نہیں مگر برا بھلا تو نہ کہو (چیخ کر) شاہ صاحب! اس وقت تو معاف فرمائیے برکت ہے"

بیوی: "شاہ صاحب بن کر آئے ہیں! پیسہ پیسہ بھیک مانگتے پھریں، کسی کو بہکائیں کسی کو دھوکہ دیں مگر ان کا کیا قصور جب ہم لوگ ان کے دھوکوں میں آتے ہیں تو اُن کی ہمت بڑھتی ہے غضب خدا کا مرد ہو کر ایسے مذہب اور مسلمان ہو کر ایسے کچے کہ ایک بدمعاش کو خدا سمجھیں۔"

میاں: "خدا تو اپنی جگہ ہے، خدا کون سمجھتا ہے، مگر اس کو ابراہیم کا نام کہاں سے معلوم ہو گیا! خدا کو دیکھا نہیں عقل سے پہچانا۔ اب بھی کچھ دے دلا کر رخصت کرو۔"

بیوی: "دھکے دیدوں بدمعاش کو اور رکھا ہی کیا ہے جو دیدوں؟ آٹا نہیں، چیتھڑا نہیں، پیسہ نہیں، بدن کے کپڑے موجود ہیں، دوپٹہ کہو تو دیدوں۔"

فقیر: "دے دے! جب نہ دیا اب دے، یا درکھ، بھول مت، دے دے، جب نہ دیا اب دے۔"

میاں: "شاہ جی اس وقت تو معاف فرمائیے۔ کچھ حاضر نہیں، دُعا کیجئے کہ اللہ میرے بچہ کو بچالے۔"

فقیر: "اچھا باوا اغوارا شاہ کی درگاہ میں آئیو۔"

صبح سے دوپہر ہو گئی ابراہیم چار برس کا بچہ لونٹھ پڑا تھا، ما اور ما کے ساتھ مشترکہ سرہانے بیٹھے دونوں اللہ اللہ کر رہے تھے۔ میاں کی تو خبر نہیں کہ انھوں نے باہر جاکر کیا چٹ کیا مگر گھر میں تو چاروں بچے بیوی اور ایک مشترکہ نہار منہ بیٹھے تھے، پیسہ پاس ہوتا تو کھانا پکتا تو درکنار پہلے بچہ کی دوا تھی، مگر معصوم کو وہ بھی نصیب نہ ہوئی۔ دو تین دفعہ بھوپی نے کہا "مشترکہ بیٹی تم جاکر کھانا کھا آؤ۔" مگر اس کی طبیعت نے گوارا نہ کیا کہ دھلروا سے لال بلوں بلوں کرتے پھریں اور وہ جا کر پیٹ بھرے۔ ظہر کی نماز پڑھ اٹھی تھی کہ پھوپا صاحب اندر آئے اور کہا: "ننھا کچھ ہوشیار رہا؟"

مشترکہ: "جی نہیں یوں ہی بے سرت پڑا ہے۔ بخار اس غضب کا ہے کہ ہاتھ نہیں دھرا جاتا۔"

پھوپا: "خیر بخار کا تو علاج ہو گیا۔ اللہ مالک ہے اب اُترا۔"

بیوی: "پیسہ کا شربت تک غریب کو نصیب ہوا نہیں، دوائی نہیں ٹھنڈائی نہیں، بخار کیونکر اُترے گا کوئی تعویذ لے آئے ہو گے۔"

میاں: "تم خدا سے فرنٹ ہو گئی ہو اس کا نتیجہ بھگت رہی ہو۔ بھگت لیا اور بھگتو گی مگر اپنے ساتھ مجھے کیوں لپٹایا تمہارے گناہوں کا عذاب بھگتنا مجھے پڑے۔ تعویذ اللہ کا نام نہیں ہے جو چند راکے پوچھتی ہو۔ میں تو پونے دو روپے کی فکر میں تھا۔ خدا کا شکر ہے مل گئے۔ بھیڑے کے گلے میں تعویذ بندھے گا۔ رات بھر بھیڑا سرہانے رہے صبح ہی اللہ چاہے بچہ اچھا ہو جائے گا۔"

مشترکہ: "جناب بھیڑے سے مقدم تو ڈاکٹر اور حکیم ہے۔ ملاحظہ کیجئے رات سے یہ وقت ہو گیا بات بھی تو نہیں کرتا۔"

بیوی: "بیٹی عمر اسی پیٹنے میں گزری، گھر میں فاقہ ہونا بلا سے، مگر ان مسٹنڈ سے فقیروں کی دعوت میں فرق نہ آئے۔ بچہ سسک رہا ہے زبان بند، ہاتھ پاؤں ٹھنڈے مگر حکیم تک جانا نصیب نہیں ہوا، ہاں بھیڑے کے لئے دام آ گئے۔"

میاں: "یہ تمہارے دام تو نہیں ہیں میں قرض لایا ہوں۔ جو علاج میری سمجھ کا ہے میں کرتا ہوں، جو تمہاری سمجھ کا ہے تم کرو۔ لاؤ دام دو جہاں کہو وہاں لے جاؤں۔"

چار پہر کی رات، اور تین پہر دن کے۔ بچہ سات پہر سے ایک کروٹ پڑا ہوا تھا، اس قماش کی ماں نہ تھی کہ چیخنا پیٹنا شروع کر دیتی۔ خاموش تھی مگر آنکھ سے آنسو نہ تھمتا تھا۔ بات چیت کر رہی تھی، مگر کلیجہ اندر سے اُمڈا چلا آ رہا تھا۔ مشترکہ کی عمر اس وقت مشکل سے پندرہ برس کی ہو گی۔ کہنے کو بچہ تھی مگر ماں کی آزادی اور باپ کی بربادی دیکھ چکی تھی، خود دیکھی بڑے میاں نے دکھائی، اس کی بھی آنکھیں نہ کھلتیں تو کس کی کھلتیں، لڑکی پہر اتھی جس کی چمک کو ارپنے کی کیچڑ ہی میں دمکنے لگی۔ اب ڈولی منگوا کر گھر آئی تو ماں نے فضیحتیاں

شروع کیں سنتی رہی اور خاموش رہی۔ وہ بگڑ چکی تو باپ نے کہا بیٹی صبح سے پھوپی کی بھیجی ہو روٹی پڑی جھک مار رہی ہے۔"

مشرکہ" جی ہاں کھاتی ہوں، ابا جان کیا عرض کروں مجھے بالکل بھوک نہیں۔ پھوپی جان کے ہاں کی حالت خدا دشمن کو نہ دکھائے۔ گھر تو برباد ہوا ہی ننھا بچہ بھی خدا ہی ہے جو بچے۔ صبح سے روتے روتے یہ وقت آگیا۔ پیسہ پاس نہیں جو ڈاکٹر کے ہاں بھیجیں بڑے اور بچے۔ سب بھوکے بیٹھے ہیں۔ کوئی عزیزوں میں اتنا نہیں کہ اس وقت سہارا دے۔"

انعام" میں ضرور مدد کرتا، مگر تنخواہ میں ابھی سات دن پڑے ہیں۔"

مشرکہ" اگر آپ مدد سے متفق ہوں تو میں کچھ بندوبست کروں؟"

انعام" بندوبست کیا کرو گی، قرض لینا پڑے گا۔ پھوپا دے تو دیں گے مگر آخر مہینہ میں۔ پھر ہمیں دقت ہو گی۔ تمہاری رائے میں کیا دینا چاہیے؟ ایک آدھ روپیہ تو خیر اس سے زیادہ کی ہمت نہیں ہے۔"

مشرکہ" اگر آپ کو قرض نہ لینا پڑے تو آپ کہاں تک مدد دے سکتے ہیں؟

انعام" بیٹی، مجھے مفت دینے والا کون بیٹھا ہے؟"

مشرکہ" جس خدا کو آپ دیں گے۔"

ہاجرہ" بیٹی تمہاری پھوپی خدا کب سے ہو گئیں!"

مشرکہ" اماں جان بندہ خدا کیسے ہو سکتا ہے۔ نعوذ باللہ! مگر خدا کے حاجت مند بندوں کی خدمت خدا ہی کی خدمت ہے، یہ حدیث ہے میری رائے نہیں۔ پھوپی جان سے زیادہ اس وقت کون حاجت مند ہو گا، آٹھ پہر صاف نکل گئے اور معصوم بچوں کے منہ میں کھیل کا دانہ تک نہیں گیا۔ بچہ گھر میں پڑا ہے اور کسی سے یہ نہ ہو سکا کہ جھوٹے موٹے آکر خیر صلاح پوچھ لیتا۔ صد آفریں پھوپی جان کو مردے کو کلیجے سے لگائے پڑی ہیں، چاند سے چہرے ممتی بھر چنوں کو ترس رہے ہیں، اور کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلا نہیں، شاباش اس محلہ پر

کہ مسلمان پڑوسی پر یہ کچھ گزر جائے اور خبر تک نہ ہو مسٹنڈے بھک منگے پیر فقیر نقدیاں اڑائیں اور معصوم فاقہ سے دن بسر کریں۔ ابا جان آپ ہی کی تنخواہ میں سے کچھ بچا بچایا میرے پاس موجود ہے، اور اس کا صرف اس سے بہتر نہیں ہو سکتا۔ مس رڈیوڈ غیر مذہب، غیر قوم، غیر وطن، جان نہیں پہچان نہیں، مگر صرف یہ سُن کر کہ ایک گھر پر مصیبت آئی دو دفعہ آ چکی ہے کہ کسی طرح عیسائیوں کے ہسپتال میں لے جائے مگر اللہ غنی پھوپی جان کے صبر پر دونو دفعہ صاف کہدیا "مس صاحب آپ کی عنایت کا شکریہ مسلمانوں کا محلہ مسلمان کا بچہ ہم ابھی ایسے گئے گزرے نہیں ہوئے کہ آپ کی مدد طلب کریں" اگر وہ چلی جاتیں یا بچہ کو بھیجدیتیں تو سمجھو یا نہ سمجھو کنبے بھر کی ناک کٹ جاتی"۔

انعام "بیوی اللہ تیری عمر دراز کرے جو تیرے پاس ہے تو شوق سے لیجا اور دیدے"۔

مشترکہ "میں چھوٹی ہوں میرا دینا مناسب نہیں، آپ ان کے بزرگ ہیں، آپ اپنے ہاتھ سے دیجیے۔ جو کہیے وہ لا دوں؟"

انعام "تمہارے پاس جمع کتنی ہے۔ یہ تو بتاؤ؟"

مشترکہ "آپ جو کچھ دیں فرمایئے اللہ دے گا"

انعام "کم سے کم دس روپیہ تو دوں"

مشترکہ "بہت اچھا ابھی حاضر کرتی ہوں"

اتنا کہہ کر مشترکہ چھپا چھپ کوٹھری میں گئی اور دس روپیہ چھن چھن گن دئے۔ باپ نے سر کو بوسہ دیا۔ ماں سناٹے میں رہ گئی۔ انعام نے جا کر بہن کو روپیہ دئیے اور تھوڑی دیر بعد ایک رومال میں کچھ آٹا باندھ مشترکہ بھی پہنچی۔

پھوپی بدنصیب روپیہ ہاتھ میں آتے ہی سمجھ گئی تھی کہ یہ بھائی بھاوج کی نہیں بھتیجی کی عنایت ہے۔ مشترکہ کے اترتے ہی بیساختہ دل سے دعا نکلی مگر ضبط کیا اور ان آنسوؤں کو جو فرطِ محبت سے نکلے تھے پی گئی۔ بچہ میں لے جانے کی طاقت

نہ تھی۔ ڈاکٹر کو گھر پر بلایا۔ دیر پر بگڑا، غفلت پر خفا ہوا، اور مجبوری پر خاموش ہو گیا، دوا دی، مرہم دیا، علاج کیا، تسکین دی، اور چلا گیا۔

بچہ تھا تو سیانا، مگر ہوش ہی نہ تھا کہ اٹھ کر دوا پیتا۔ یہ موقع بھی دیکھنے والوں کے لئے عجیب ہوتا ہے۔ وہی ماجو بچہ کی ایک ہوں سے بےچین اور پھانس سے مضطرب ہو جاتی تھی، قصائی بن کر زبردستی دوا حلق میں ڈال رہی تھی۔ دس بجے رات کے دوسری خوراک دی گئی۔ بچہ نے ذرا آنکھ کھولی۔ بچہ کا آنکھ کھولنا تھا کہ مصیبت زدہ ماکو عید ہو گئی۔ مامتا بھی کیا چیز ہے۔ مکان کی مصیبت فاقے کی اذیت، دن بھر کی کلفت سب بھول بسر گئی، جھکی، پیار کیا، بچہ نے پانی مانگا، پانی دیا، اب ذرا جان میں جان آئی تو ان معصوموں کا خیال آیا جن کو روٹی کی صورت دیکھے بارہ پہر ہو گئے تھے، اور ایک ایک کا منہ حسرت سے تکتے سو گئے تھے۔

اطمینان ہوا تو مشرکہ نے کہا "پھوپی جان میرے پاس تھوڑا سا آٹا ہے اب آپ کہاں منگوائیے گا۔ رات زیادہ آگئی میں دال چڑھا کر روٹی ڈال دیتی ہوں۔"

پھوپی۔ "اے ہے میری بچی تو کہاں تکلیف اٹھائے گی میں خود اٹھتی ہوں۔"

مشرکہ۔ "نہیں اچھی پھوپی جان! آپ یہاں بچہ کے پاس بیٹھے میں ابھی تیار کرتی ہوں"

پھوپی منع کرتی رہی اور مشرکہ نے جلدی اٹھ، دال دھو، پتیلی رکھ، آٹا گوندھ، توا چڑھا دیا۔ پھر اسرہانے بندھا ہوا بین کر رہا تھا اور فاقہ زدہ بچوں میں سے جس کی آنکھ لگ جاتی تھی امی کو اٹھا بٹھاتا تھا۔ رات کے دس بجے ہوں گے جو مشرکہ کھانا پکا کر لائی۔ بچوں کو کھانا کھلایا۔ پھوپا صاحب بہادر کے آگے رکھا اور پھوپی کے آگے لے کر بیٹھی۔

جب چڑیا کے بے زبان بچے جن میں طاقت پرواز اچھی طرح نہیں ہوتی، پہلی مرتبہ اپنے ننھے ننھے پروں سے کام لیتے اور ماں باپ کے ساتھ گھونسلے سے باہر آتے ہیں، اس وقت دفعتاً ظالم کوا آن پڑتا ہے اور اس سے پہلے کہ ماں باپوں کی آنکھ کے سامنے ظالم اپنے

پنجہ میں رکھ لے اتفاق سے کوئی شخص اس کو اڑا دیتا ہے اور اس طرح کمزور مخلوق طاقتور کے دستِ اجل سے محفوظ ہو جاتی ہے، گو ماں باپ اس کا شکریہ ادا کرنے کے قابل نہیں ہوتے مگر اُن کی معصوم چیں چیں میں جب وہ پر اور دُم سکیڑ کر اس شخص کو دیکھتے ہیں شکریہ کے وہ تمام الفاظ پنہاں ہوتے ہیں جو ایک آدمی ادا کرتا ہے۔ اسی طرح اس وقت پھوپی کی نگاہ مشرکہ کے چہرے پر تھی اور گو اس نگاہ میں قوتِ گویائی نہ تھی مگر شکریہ کا اظہار اور احسان کا اعتراف موجود تھا۔ انتہائے محبت میں اس نے ہاتھ بڑھا کر بھتیجی کے گلے میں ڈال دیا۔ اس کا سر اپنے قریب کیا، سینہ سے لگایا اور یہ کہہ کر کہ "اللہ صاحب نصیب کرے،" کھانا کھانے بیٹھ گئی۔"

رات جوں توں گزری۔ بچہ کئی دفعہ ہوشیار ہوا، بخار ہلکا تھا۔ صبح ہوتے ہی بکرا ذبح اور گوشت تقسیم ہوا۔ ظہر کی نماز کے بعد جب بچہ کی حالت بہتر تھی اور مشرکہ گھر جانے کو تیار، صاحب بہادر نے کہا "دیکھ لو ایک ہی تعویذ میں لڑکے کی حالت کیا سے کیا ہے۔"

مشرکہ: آپ جیسے بزرگ کے سامنے میرا کچھ عرض کرنا یقیناً گستاخی ہے۔ مگر آپ کے اس عقیدے پر مجھے ہنسی آتی ہے کہ وہ موٹی موٹی باتیں جو ہر شخص بآسانی سمجھ سکتا ہے آپ اُس پر توجہ نہیں فرماتے۔ میں اچھی طرح واقف ہوں کہ صدقہ اور خیرات خدا کا غصہ ٹھنڈا کرنے، بلا کو دور کرنے اور مصیبت کو ٹالنے کا سب سے اچھا ذریعہ ہے، بشرطیکہ وہ سچے دل، پکے عقیدے، نیک نیت اور صاف طبیعت سے کیا جائے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آدمی خدا پر بھروسہ کر کے اپنی کوششوں سے دست بردار ہو جائے۔ کوئی عقل اس کو گوارا، کوئی رائے اس کو صائب اور کوئی خیال اس کو سچا نہیں سمجھ سکتا کہ انسان تقدیر کے بل پر تدبیر سے غافل ہو جائے۔ آپ کا یہ بکرا خدا کی راہ پر تھا تو اس کے سرہانے بندھنے کی وجہ سمجھ میں نہ آئی۔ یہ اگر بندگانِ خدا اور حاجتمندوں کی خدمت تھی تو گلے میں تعویذ بندھنے کا سبب معلوم نہ ہو سکا۔ مجھے بزرگوں کی دعاؤں سے انکار نہیں لیکن پھوپا جان جس دربار

سے اپنے محبوب کو بعض معاملات میں کورا جواب مل جائے، ماکی مغفرت کی التجا کریں، اور پتہ نہ چلے کہ مقبول ہوئی یا نہیں، جس سرکار سے ایک تیوری کا بل اندھے کی حمایت میں پیغامِ عتاب ہو جائے اس کی باتیں اسی کو سزاوار ہیں۔ یہ چھوٹی موٹی چیزیں معمولی قصے قضئے غور سے دیکھئے تو مذہب کا خاتمہ کر دیتے ہیں اور شرک کا ایسا پہاڑ سر پر ڈھا دیتے ہیں جو اٹھائے اُٹھے نہ سرکائے سرکے۔ غور کیجئے اور سوچئے کہ آپ کا پاک مذہب کیا ہے اور سچے مسلمان خدا اور رسول صلعم میں کیا فرق سمجھتے تھے جس وقت سرور دو عالم ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی سے ایک دفعہ غلط فہمی کی وجہ سے مکدر ہو گئے ہیں اور خدا نے وحی کے ذریعہ سے اُن کی برأت فرمائی تو یہ وہ وقت تھا کہ ام المومنین سخت بیمار تھیں اُن کی والدہ نے فرمایا "جاؤ رسول اللہ کا شکریہ ادا کرو" انھوں نے ماکو جواب دیا "کیوں رسول اللہ کا شکریہ کیوں ادا کروں شکریہ اُس خدا کا نہ ادا کروں جس نے مجھ پر رحم فرمایا" جو بات بظاہر کوئی وقعت نہیں رکھتی وہ شرک کے درجہ تک پہنچ کر آدمی کو برباد کر دیتی ہے، سُنا تو یہ تھا اور دیکھا بھی یہی ہے کہ عورتیں اس جھگڑے میں زیادہ گرفتار ہوتی ہیں، مگر آج میں اُلٹی بات دیکھ رہی ہوں کہ آپ مرد ہو کر اس چکر میں پھنسے ہوئے ہیں۔"

بھوپا صاحب بہادر: "تم بچی ہو، دو چار کتابیں پڑھ کر، یا مولانا خداداد کی صحبت میں رہ کر ایسی فاضل ہو گئیں کہ ہم کو سبق دینے لگیں!!"

مشرکہ: "جی نہیں توبہ توبہ میں آپ کو کیا سبق دوں گی میں نے تو ایک بات عرض کی تھی۔"

بیسواں باب

انعام کی مالی حالت اصلیت پر تو ابھی نہ پہنچی تھی، اور نہ پہنچ سکتی تھی مگر بہت کچھ درست ہو گئی تھی۔ دروازے پر گھوڑا تو نہ تھا مگر گھر میں ماما ضرور تھی۔ مکان گھر کا اتنی جلدی تو کیا ہو جاتا مگر قرینہ کا اسباب ڈھنگ کا بچھونا ضرورت کی چیزیں موجود تھیں۔ دو چار زیور لڑکی کے اور ایک آدھ ماں کے پاس بھی ہو گیا تھا۔ سو پچاس روپیہ گھر میں بھی رہتا تھا، غرضہ

کی قسط تھی تو کڑی اور بھر مٹھی بیس روپیہ ماہوار کی کٹوتی کچھ کم نہ تھی مگر خدا بھلا کرے مشرکہ کا
کوار پتے ہیں ماباپ کے واسطے فرشتۂ رحمت ہوگئی اور جو باپ ہمیشہ کے لئے نکّو اور رسوا کے
واسطے کبھونڈی ہوچکی تھی اُن کو پھر ایک دفعہ آدمیوں کے زمرہ میں ملوا دیا۔ اس کی قابلِ فخر
زندگی اور لایق قدر کارنامے اپنے ہی گھر تک محدود نہ تھے۔ دوست دشمن اس کی نظر میں، اپنا
پرایا اُس کی نگاہ میں، عزیز و غیرہ اُس کے نزدیک، سب ایک تھے۔ بڑے میاں کی زندگی کا یہ
آخری کارنامہ تھا کہ انعام اور ہاجرہ جیسے ماباپ کی بچی سارے کنبہ کا مول اٹھی۔
عزیز اُس پہ جتنا ناز کرتے بجا، کنبہ اُس پہ جس قدر فخر کرتا جائز، باپ اُس پہ جتنا گھمنڈ کرتا
سچا، اور ماں اس پر جتنی بھی اتراتی درست۔ لڑکی دیکھتے ہی دیکھتے ککڑی کی بیل کی طرح کہیں
سے کہیں پہنچ گئی۔ چاروں طرف سے پیام آنے شروع ہوئے مگر اس معاملہ کا اختیار
بڑے میاں کو تھا اور وہی ازابتدا تا انتہا مختار تھے۔ مگر تقدیر کی بات تھی کہ ایک نوالہ کھیر کا
زہر قاتل ہوگیا، خاصی اچھی طرح کھا کر اُٹھے، ہاتھ دھوئے، کُلّی کی نماز کو جا رہے تھے کہ سینہ
میں کسک معلوم ہوئی، درد اٹھا، بخار چڑھا، ڈاکٹر، حکیم، نو میں، سب آئے گئے مگر درد کو،
افاقہ نہ بخار کو جنبش، تین دن اور تین رات اسی طرح گزرے۔ بڑے میاں نگوڑے نا ٹھے
تو تھے نہیں، پوری عمر کے آدمی، بیٹے، بیٹیاں، پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں کچھ نہیں تو
کوڑی بھر اپنی اولاد، اولاد کی اولاد موجود تھی۔ اور بچے بھی آج کل کے نہیں اگلے زمانہ کے
صورت کے عاشق، چہرے کے شیدا، کسی نے پٹی نہ چھوڑی، مگر ان سب سے زیادہ پریشان
مشرکہ تھی کہنے کو دُور کی رشتہ دار مگر اپنے سو جانے اور اُس کی پلک سے پلک جھپکنا حرام تھی۔
رات کو جب سناٹا ہوتا تو اُن احسانات کو یاد کرتی جو بڑے میاں نے کیے۔ اس وقت دل خود
بخود گواہی دیتا کہ گھر تباہ آبرو ختم اور عزت برباد ہو چکی تھی مگر صرف ایک دَم نے جب
بہن اور بھائی سب کنارے ہوئے مسیحائی کی۔ جہاز بھنور میں تھا۔ گھٹا چھائی ہوئی تھی۔
بادل کڑک رہا تھا، بجلی چمک رہی تھی، برسات کا موسم اندھیری رات، اور سوائے خدا کی

ذات کے کوئی امیرانہ تھا، اس وقت یہ شخص تھا جس نے بیڑا پار کیا، اور ہم صحیح سلامت کنارے پر پہنچے۔ اب یہ محسن جدا ہوتا ہے اور سچ یہ ہے کہ آج ہم تینوں یتیم ہوتے ہیں۔ یہ خیالات پیدا ہوتے ہی اُن کے تلوے اپنی آنکھوں سے ملتی۔ شاید چوتھی رات کا ذکر ہے، مشرکہ اسی طرح قربان ہو رہی تھی کہ بڑے میاں نے آنکھ کھولی پانی مانگا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا:-

"ناصرہ بیٹی میں دیکھ رہا ہوں کہ تم ضرورت سے زیادہ پریشان اور حد سے زیادہ رو پیٹ رہی ہو مگر میری جان موت پر بے صبری' ناشکری کا ثبوت اور خود غرضی کی علامت ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ جتنی تربیت میں تمہاری کرنی چاہتا تھا نہ کر سکا۔ یہ میرا آخری وقت تھا اور وہ وقت جب خود میری زندگی مجکو دوبھر تھی، پھر بھی کیا ہو سکتا تھا اور کرتا رہا جو ممکن تھا تم اُس شخص کی پوتی ہو جو میری عمر کا رفیق، برابر کا بازو اور سچا دوست تھا اور جس کی زندگی مسلمانوں کے لئے ایک نمونہ تھا۔ تمہارے ماباپ اپنے ہاتھوں رسم کے پیچھے دین اور دنیا دونوں سے گئے گزرے ہوئے۔ میں آجتک اُن کی حالت میں اصلاح نہیں دیکھتا۔ مگر وہ تو اپنی بھگت چکے ان کی دنیا ختم کے قریب اور انجام کے پاس ہے۔ مجھے رونا تمہارا ہے کہ کہیں یہ چکر تم کو نہ پھنسا لیں اور دنیا کے ساتھ بدنصیب ما اور کم بخت باپ کی طرح تمہارا دین بھی رخصت نہ ہو جائے۔ مجھ میں بولنے کی ہمت اور طاقت نہیں۔ جب تک زندہ ہو یہ خیال رکھنا کہ شرک کے قریب نہ جاؤ۔ مکار پیروں سے بچنا اور اس لئے زندہ رہنا کہ اسلام پر خاتمہ اور نیکوں کے ساتھ حشر ہو۔ یہ وظیفہ ہمیشہ پڑھنا توفنی مسلما والحقنی بالصالحین سچ پوچھو تو تمہاری زندگی کی ابتدا بھی نہیں ہوئی تمہاری زندگی ابھی وہ کونپل ہے جو پھوٹی تک نہیں لیکن وہ وقت آنے والا ہے جب تم اِس دنیا میں شریک ہوگی، اس کونپل میں بھی پھول آئیں گے اگر زندگی ہے تو وقت بھی دور نہیں جب اس درخت کا سایہ دُور دُور پھیلے گا۔ بہت سے خدا کے بندے اس سے متعلق ہوں گے۔ کچھ معصوم روحیں ہوں گی، تھوڑے سے دنیادار انسان ہونگے جن کی دنیا تمہارے دم سے اور زندگی تمہاری ذات سے وابستہ ہوگی' تمہاری یہ عمر آزادانہ اور یہ دن بے فکری کے ہیں، مگر وہ وقت سمجھداری کا اور وہ زمانہ ذمہ داری کا ہوگا۔ اس زندگی میں

تم کو ایک دولت ملے گی جو اپنے سے زیادہ عزیز اور ایمان سے بڑھ کر بھاری ہوگی یعنی وہ چیز جس پر خدا اپنے بندے کو آزماتا اور وہ کسوٹی جس پر مالک اپنے غلام کو کستا ہے اور جو اولاد کی صورت میں عورت کے سامنے آتی ہے یہ وہ شے ہے جس کی محبت میں عقل دیوانی اور آنکھیں اندھی ہوجاتی ہیں یہ ہے وہ راستہ جہاں انسان گمراہ ہوتا ہے، خدا سے بھٹکتا ہے، سمجھ پر پتھر پڑتے ہیں، آنکھیں خیرہ ہوتی ہیں اور زبان سے کلمہ توحید پڑھنے والیاں جن کی زندگی کا دارومدار صرف ان الفاظ پر ہوتا ہے "خدا ایک ہے" سیکڑوں خداؤں کی پرستش کرتی ہیں، قبروں پر جاتی ہیں، عرسوں میں شریک ہوتی ہیں اور اس زندگی کے ساتھ اُس زندگی کو بھی خراب کر لیتی ہیں۔ خوش نصیب ہیں وہ عورتیں جو ان خاردار جھاڑیوں اور پیچیدہ وادیوں سے پھول کی طرح گزر جائیں اور رب کی صراط ان کو صراطِ مستقیم پر پہنچا دے۔ میری ماموں زاد بہن کا ذکر ہے وہ زندہ نہ ہو مگر اُس کی دیکھنے والیاں ابھی زندہ ہیں۔ یہ بیوی دنیاوی راحتوں اور عیش و عشرت سے مجبور تھی، یا معذور مگر جنت کی حور تھی، جس کی قبر پر آج بھی نور برس رہا ہے۔ وہ مہندیوں میں آرام کرنے والی ظاہری آنکھوں سے پنہاں ہوگئی مگر ایسے کام چھوڑ گئی کہ مجھ جیسے بیسیوں اس پر فخر کرتے ہیں۔ باغبان قدرت نے صرف ایک پھول اُس کی تقدیر میں لکھا تھا اور یہی ثمرِ حیات اُس کی زندگی کی تمام کائنات تھی۔ جس وقت یہ بچہ جوان ہوا ہے اور اس کی شادی کی تیاریاں ہوئیں تو میں کہہ نہیں سکتا کہ ماں کے دل کی کیا کیفیت تھی اور اُس کا باغ باغ چہرہ کیا بتا رہا تھا۔ برات میں دھوم دھام تو نہ تھی مگر اس شادی کا ہر ذرہ نکاح کی غایت اور اسلام کی عظمت کا پتہ دے رہا تھا دولھا کی ماں کہنے کو تو عورت تھی مگر سنت رسول کو جس طرح اُس نے سمجھا اچھے اچھے مرد مشکل سے اتنا سمجھ سکیں گے جب نکاح ہو چکا ہے تو آسمان ابر آلود تھا، جھاڑے کے دن تھے، اس خیال سے کہ مینہ زیادہ نہ آجائے جلدی جلدی چلنے کی تیاریاں ہوئیں، مینہ زیادہ تھا مگر جس طرح ہو سکا ٹھیک کیا دولھا اپنے گھر چلا، آگے آگے مشکی گھوڑے پر وہ، پیچھے پیچھے دلہن کی پالکی، اس کے بعد جہیز اور براتی، سب سمدھنیں گاڑیوں میں تھیں مگر صرف دولھا کی ماں ایک ڈولی میں تھی۔

پردے میں سے اپنے دولھا کی صورت دیکھ رہی تھی، ہاتھ میں تسبیح تھی اور اس طرح یہ بیوی اپنے خالق ذوالجلال کا جس نے یہ خوشی کا دن دکھایا شکریہ ادا کرتی جاتی تھی۔ دولہا کے باپ چاندی کے پھول، اٹھنیاں، چونیاں اور روپے نچھاور کرتے چلے جا رہے تھے کہ ایک بڑھیا عورت لنگڑاتی ہوئی سامنے آئی اور کہا "خدا تیرے دولھا کو پروان چڑھائے دو وقت سے بھوکی ہوں، پیٹ بھر دے" بھوڑے کی دیگیں، روٹیوں کے خوان اپنے ساتھ، بھٹیاروں کے تندور، نان بائیوں کی دکانیں آنکھ کے سامنے، ریزگاری کا رومال ہاتھ میں مگر وقت کی بات ہے مطلق توجہ نہ کی۔ بڑھیا حسرت سے منہ تکتی ہوئی دو چار قدم لڑکھتی پھر گئی چل چلا مایوس ہو کر بیٹھ گئی، بوندیاں ہلکی ہلکی پڑ رہی تھیں۔ سڑک پر گارے کا بچھونا اور راستہ چلنوں کے کپڑے کیچڑ میں لت پت تھے کہ دفعتاً بادل کڑکا اور اس زور سے کہ دل دہل گئے۔ کوئی ایک لمحہ نہ گذرا ہوگا کہ دولھا پہ بجلی گری سائیس گھوڑا اور دولہا جل کر خاک سیاہ ہوگئے۔ کیسا دردانگیز سماں اور قیامت خیز وقت تھا۔ باپ یہ رنگ دیکھتے ہی بیہوش ہو کر گر پڑا! خدا کی شان ہے جب دولھا کو دیکھ دیکھ کر ماں نہال ہو رہی تھی، وہ اب پہچانا بھی نہ جا سکتا تھا، ماں نے جس وقت ان جلی ہوئی ہڈیوں اور راکھ کے ڈھیر کو چھاتی سے لگا کر سر آنکھوں پہ رکھا ہے اس وقت کا منظر خدا دشمن کو نہ دکھائے! دولھا مر گیا، برات اُجڑ چکی، شادی کی محفل سوگ کی مجلس اور بھوڑے کا کھانا دولھا کی حاضری ہوگئی! انا صابرہ بیٹی! سوچو کہ بدنصیب ماں کی کیفیت اُس وقت کیا ہوگی مگر وہ نیک بندی گھر پہنچی تو سب سے پہلے وضو کیا، نماز پڑھی، اور عرض کیا "معبود حقیقی اپنی مصلحت تو ہی خوب جانتا ہے اگر یہ میرے گناہوں کی سزا ہے تو معاف کر اور اپنی رحمت کاملہ سے بخش دے" اس کے بعد باہر آئی ان جلی ہوئی ہڈیوں کو بوسہ دیا اور کہا "خدا کی مقدس مرضی یہی تھی۔ یہ ہماری آزمایش کا وقت اور امتحان کا موقعہ ہے دولھا کے باپ سے کہو جس طرح کل غسل ہوا تھا اسی طرح آج غسل دے کر اصلی گھر پہنچا دو"

باپ کی حالت زار خراب ہوگئی امید یہ تھی کہ رفتہ رفتہ یہ صدمہ زائل اور رنج کم ہو جائے گا، مگر خلاف توقع وہ روز بروز گرتا گیا اور چند ہی روز میں چارپائی سے لگ گیا۔ جب ہوش آتا اور بچہ کی

تصویر آنکھ کے سامنے پھرتی تو ایک آہ کرتا اور یہ کہہ کر بیہوش ہو جاتا "ہائے جواں شبیر ہمیشہ کو چھوٹ گیا۔" ماجس کی گھٹی میں صبر اور طینت میں شکر تھا خاموش ہو گئی پھر بھی جب کبھی اس کا خیال آتا جو گود میں چھوٹے سے بڑا اور آنکھوں کے سامنے بچے سے جوان ہو کر ہمیشہ کو جدا ہو گیا تو کلیجہ پر برچھیاں چل جاتیں ایک ٹھنڈا سانس بھر کر خاموش ہو جاتی اور اس اُمید پر کہ مر کر اس ٹکڑے سے آنکھیں ٹھنڈی اور حسرت پوری کروں گی سجدے میں گر پڑتی۔ دن دعاؤں میں ختم اور رات التجاؤں میں فجر ہو جاتی، صرف اتنا ارمان تھا کہ ایک دفعہ اس صورت کو جو چھپ گئی اس چاند کو جو گہنا گیا، اس پھول کو جو مرجھا گیا، گلے سے لگا لوں۔ گھنٹوں روتی، گھڑیوں بلبلاتی اور پہروں سجدے میں رہتی مگر باپ گو مرد تھا اور تنومند چند ہی روز میں حالت خراب ہو گئی۔ دیوانوں کی طرح ادھر اُدھر سودائیوں کی مانند چاروں طرف ٹکریں مارتا، جنگلوں میں نکل جاتا، ہوا کو دیکھتا درختوں پر نظر ڈالتا، سرسراتے ہوئے پتے، چلتی ہوئی ہوا اس کے زخموں پر نمک چھڑکتی۔ چہکتے ہوئے پرند، کھلتے ہوئے پھول اس کے داغ ہرے کرتے، گرتے ہوئے آبشار، بہتا ہوا دریا، چمکتا ہوا چاند، دمکتے ہوئے تارے، اس کی یاد تازہ کرتے۔ دن یادِ دلدار میں گزر جاتا اور رات خیالِ یار میں کٹ جاتی۔ قدرت کی قندیل آسمانی قمقمے باری باری گُل ہو جاتے، چاند ماند پڑ جاتا، اور شب چہاردہم کی روشنی بجھ جاتی مگر اس کی لگی نہ بجھتی کڑکڑاتے جاڑوں کی راتیں اس بیابان میں جہاں دانت سے دانت بجتا تھا اور گرمی کے پہاڑ سے دن اور قبرستان میں جہاں ہر طرف عالم سنسان تھا حدِ انتہا کو پہنچ جاتے، دن ترقی کرتے، سال آگے بڑھتے، مگر اس بدنصیب کی حالت میں تغیر نہ ہوتا، قلب گذشتہ کا لوتھڑا تھا، پتھر نہ تھا۔ دماغ دماغ انسانی تھا جانور کا نہ تھا۔ ہجومِ افکار اور انتہائے مصائب نے دماغ بیکار کر دیا۔ یہ بھی عجیب وقت تھا، بدنصیب بیوی جواں شبیر کو ہمیشہ کے لئے رو چکی تھی جس کی آنکھیں فراقِ ابدی کا دریا اور جس کا سینہ مستقل جدائی کا چشمہ تھا، شوہر کی حالت دیکھ کر خدا کا شکر ادا کرنے لگی، انسان تھی بعض دفعہ گھبرا جاتی اور ممتا کے مقابلہ میں شوہر کی یہ حالت بارِ گراں ہو جاتی مگر پھر خیال آتا میرا دین، میری دنیا، میری جنت، میری دوزخ، میرا خدا، میرا رسول،

میرا عذاب، میرا ثواب، جو کچھ ہے اس شخص کے ہاتھ میں اور اس صورت کے ساتھ، میں پڑھ چکی ہوں اور مجھے یاد ہے کہ جب مدینہ منورہ کی مشہور تاجر حولا حضور اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی، سرکار اس وقت موجود نہ تھے ام المومنین عائشہ صدیقہؓ اس سے باتیں کر رہی تھیں کہ اتنے میں شاہِ دوجہاںؐ تشریف لے آئے حولا معمولی عورت نہ تھی اس کا شہرہ تمام عرب میں تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں اس کا سارا بدن خوشبو میں مہکا کرتا تھا۔ ابھی قدم مبارک سرور عالمؐ کا دروازہ میں تھا کہ حولا کی خوشبو نے حضور کا دماغ معطر کر دیا اور آپ نے فرمایا کہ "عائشہ! کیا حولا آئی ہے"؟ ام المومنینؓ نے فرمایا "جی ہاں" حولا نے اپنے خاوند کی شکایتیں تمام و کمال بیان کیں اور بالآخر عرض کیا "یا رسول اللہ خدمت کی حد اور عجز کی انتہا ہو چکی، اب میں مجبور ہوں۔ جو کرنا تھا وہ کر چکی آپ حکم دیجیے کہ کیا کروں"۔

حضورؐ نے فرمایا "کیے جا جو کر رہی ہے اور اس کے صلہ کی توقع خدا سے رکھ" میں مسلمان ہوں شوہر کی خدمت میرا فرض اور اس سے ہمدردی میری زندگی کا عین مقصد، بچہ کو روتی ہوں میری مامتا ہے کسی پر احسان نہیں، مگر شوہر سے ہمدردی خدا کا حکم اور رسول کا ارشاد ہے۔

ناصرہ بیٹی! اس جنتی بیوی کا دل یہ خیال آتے ہی خدا کے خوف سے لرز جاتا تھا اس نے شوہر کی جو دیوانہ ہو گیا تھا وہ خدمت کی ہے کہ کیا کوئی نوکر یا لونڈی کرے گی! سب زیور اور کل اثاثہ حکیموں اور ڈاکٹروں کی نذر کر دیا پہروں بیٹھتی اور بچوں کی طرح شوہر کو اپنی گود میں لٹا کر لے جاتی۔ جب کسی طرح آرام نہ ہوا تو لوگوں نے صلاح دی کہ یہ دیوانگی کسی جن کا سایہ ہے۔ ڈاکٹر حکیم کیا خاک جانیں کسی ملا سیانے کو دکھاؤ۔ مریض کی بہن یعنی بدنصیب ماں کی نند آخوند جی کی مرید تھیں۔ دوسرے دن صبح ہی ان کو لے آئیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے آخوند جی بنے ہوئے فقیر نہ تھے۔ بہت متوکل شخص اور بغدادی نصیر اللہ شاہ کے مرید تھے، تعویذ دیا گنڈا باندھا دیا دھونی تجویز کی اور ایک مرغ سیاہ جس کے خون سے نقش لکھنا تھا منگوایا، بہن ماں جائی ایک ہی ماں کے پیٹ میں دونوں نے پاؤں پھیلائے تھے بھائی کی مصیبت پر آٹھ آٹھ آنسو روتی تھی اسی وقت مرغ لیکر پہنچی اور تعویذ لا کر گلے میں ڈالا یہاں تک چنداں مضائقہ نہ تھا لیکن جب آخوند جی نے یہ کہا کہ چالیس دن اکبر شاہ کے مزار پر چراغ جلاؤ"

تو بیوی نے صاف انکار کر دیا اور کہہ دیا مسجد خانہ خدا ہے اگر وہاں فرمائیے تو چالیس دن کیا چالیس مہینے اور ایک چراغ کیا دس قندیلیں روشن کرا دوں، اور اسی پر بس نہیں جھاڑو دے دوں صحن دھوؤں مگر مزار کی کر تو کبھی نہ لگاؤں گی۔ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ ہے۔ چادر اور چراغ سے واسطہ کیا" بہن بیچاری چار آنے ڈولی۔ کاہے کوسوں رہتی تھی۔ بال بچوں میں پھنسی، گھر کے دھندوں میں گھڑی دو چار گھڑی ادھر آئی تو ادھر سارے کام چوپٹ تھے، چراغ کا انتظام کرتی نہ کرتی بیوی، اس نیک بخت نے جواب دے دیا۔ یہ بھی وقت کی بات تھی کہ اخوندجی کے علاج سے میاں کی حالت بہت کچھ سنبھل گئی، ایک آدھ بات ٹھکانے کی کر لیتا، بھوک لگتی، تو مانگ لیتا۔ پیاس ہوتی تو کہہ دیتا۔ وہ جنون بھی کم ہوا اور چیخنا پیٹنا بھی جاتا رہا۔ دیکھو کیسا نازک موقع تھا کوئی دوسری عورت ہوتی تو یقیناً ڈگمگا جاتی، بیوگی آسان چیز نہیں ہے۔ یہ مصیبت جن پر آن پڑی ان ہی کے دل جانتے کہ وہ بیچاریاں کیا چکھ چکیں اور چکھ رہی ہیں، بالخصوص اس عورت کے واسطے جس کے سر پر کوئی اور وارث تک نہ ہو۔ لیکن واہ واہ کیا مستقل مزاج بیوی، ثابت قدم عورت اور نیک نفس خاتون تھی کہ اپنے عقیدے سے نہ پھری، جب شوہر کی حالت خراب ہوئی اور لوگوں نے پھر دوبارہ یورش کی اور کہا سنا کہ خاصے اچھے بھلے چنگے میاں کو تم نے قبر میں پہنچایا، چالیس دن کا چراغ ایسی کیا مصیبت تھی کہ جل نہ سکا۔ خود تو جانا نہ تھا، جس کے ہاتھ پر پیسہ رکھتیں، ہزاروں خوشامدیں کرتا اور جاتا تو بھی اس سچی مسلمان اور خدا کی نیک بندی پر اثر نہ ہوا شیطان بہکا رہا تھا اور شیطان کے بھیس میں یہ بیسیوں صورتیں شرک کی طرف گھسیٹ رہی تھیں مگر توحید کی زبردست زنجیر اس کے پاؤں میں تھی جو ان جھوٹی طاقتوں سے نہ ٹوٹ سکی۔ یہاں تک کہ قانون قدرت کے بموجب شوہر کا آخر وقت ہوا۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ زخمی دل اور مجروح دماغ پر یہ چوٹ ایسی کاری تھی کہ بڑے بڑے مرد گھبرا جاتے۔ جن آنکھوں کے آنسو روتے روتے خشک ہو چکے تھے اور جو آنکھیں خوشی کے نام کو ترس گئی تھیں اب ان کے سامنے یہ جگر خراش منظر، قیامت سے کم نہ تھا۔ مگر کیا مجال جو سوا صبر اور شکر کے ایک لفظ زبان سے

نکلا ہو، جب حالت بگڑنے لگی تو اس نے سب سے پہلے نماز پڑھی سجدے گری اور کہا "سچے مولا میرے دل کا حال تجھ کو معلوم ہے، میں نے اس صورت سے روپیہ پیسہ عزیز نہیں کیا، میں نے خدمت اور محنت سے منہ نہیں پھیرا، میں نے علاج میں اپنی طرف سے کسر نہیں کی۔ مگر اتنی گنہگار ضرور ہوں کہ اپنے ایمان پر حرف نہیں آنے دیا۔ میں اس موت کو نہایت خوشی سے برداشت کرتی ہوں اور سجدۂ شکر بجا لا کر کہتی ہوں، حقیقی مالک میرا منہ نہیں کہ تیرا شکر ادا کر سکوں، زبان نہیں کہ تیری عنایتوں کا اظہار کروں، تو نے اپنی قدرت سے، اپنی عنایت سے مجھکو توفیق دی۔ توحید پر قایم رکھا، شرک سے بچایا اور شیطان کے جال میں نہ پھنسنے دیا۔" اس کے بعد وہ جنتی بیوی اُٹھی، اس نے خاوند کے ہاتھ اپنے منہ پر پھیرے اور کہا "میرے قصوروں سے درگزر کرنا۔ میری غلطیاں معاف کرنا اور قدرت والے آقا سے میری مغفرت کی سفارش کرنا۔"

سمجھیں بیٹی ناصرہ! یہ ہے مسلمان بیبیوں کا اسلام اور نیک کوکھ کی بیٹیوں کا انجام! اس واقعہ کو ہمیشہ یاد رکھنا اور اس وقت سے بچنا جب دنیا کی فانی زندگی خدا سے غافل کر دے۔ میری حالت خراب ہو رہی ہے۔ اس قدر بولنے سے اور بھی نقاہت زیادہ ہو گئی۔ کچھ اور کہنے کی ضرورت اور سمجھانے کی حاجت تھی مگر اب زبان درست نہیں۔ ان باتوں کو دل پر لکھ لو۔ اور جب دنیا میں شریک ہو تو یاد رکھنا عورت کی زندگی کا بڑا مقصد یہی ہے کہ دنیا کے جھگڑوں میں پھنس کر توحید پر قایم رہے"۔

بڑے میاں کی حالت قابل اطمینان نہ تھی۔ وہ اس کے بعد دو تین روز اور زندہ رہے۔ ان کی موت یوں تو سب ہی کو رلوا رہی تھی مگر مشترکہ کی حالت بہت ہی ابتر تھی حقیقی دادا کا بھی اگر کوئی صدمہ کرتا تو اتنا ہی کرتا جتنا اس نے بڑے میاں کا کیا۔ کیونکہ بڑے میاں کی مشترکہ پر خاص عنایت تھی اور باوجود کم عمر ہونے کے بہت سی باتوں میں اس سے رائے لیا کرتے تھے اس لیے اولاد نے بھی اس کی عزت میں فرق نہ آنے دیا اور باپ کے بعد وہی آنکھیں رکھیں۔

T. How could he give ... Serman ...

اکیسواں باب

تیسرے دِن پھول تھے بڑے میاں کی شہرت اور خاندانی عزت معمولی نہ تھی، صبح سے
سے مردانہ میں گاڑیوں اور زنانہ میں ڈولیوں کا تانتا شروع ہوا ہے تو تیسرے پہر تک
تار نہ ٹوٹا۔ مردوں میں دوپہر کے بعد آنے والے اِکا دکا رہ گئے تھے مگر زنانے میں تو یہ آفت
کسی طرح ختم نہ ہوئی۔ بریانی متنجن کے طباق، قورمے کے پیالے اور فیرنی کے خوانچے
دالان سے لیکر انگنائی تک پھیلے ہوئے تھے۔ اعلیٰ چاندنیاں کھیر میں لت پت اور صحن کے
پتھر سالن میں چک بہ چک تھے۔ اس انتظام میں شریک منشر کہ بھی تھی مگر بچہ، بڑے
بڑے آدمیوں کے سامنے بولتی کیا خاک اور صلاح کیا پتھر دیتی۔ نیچی گردن کئے خاموش
بیٹھی رہی مگر پھولوں کا یہ سوانگ منشر کہ کو ایک آنکھ نہ بھایا۔ دن بھر انگاروں پر لوٹتی اور
ایک ایک کا منہ تکتی رہی۔ بیویاں جس وقت دوپٹہ سے منہ ڈھانک کر ہُو ہُو شروع کرتیں
اور جھوٹ موٹ کے آنسو بہاتیں تو وہ جل کر خاک ہو جاتی بڑے میاں اوّل تو اِس
عمر کو پہنچکر مرے کہ خدا دُنیا جہان کو ایسی عمریں نصیب کرے۔ اور پھر موت بچہ کی نہیں،
جوان کی نہیں کہ سُننے والے بھی اور دیکھنے والے بھی رنج و افسوس کریں۔ بڈھے کی موت
اور بڈھے بھی ایسے خوش نصیب کہ بیٹے کی جگہ بیٹے اور بیٹیوں کی جگہ بیٹیاں، بیٹوں کی
اولاد اور بیٹیوں کی اولاد بھرا کنبہ چھوڑا۔ اس کا صدمہ اگر تھا یا ہونا تو اُن کے عزیزوں کو
دوستوں کو رانڈوں کو یتیموں کو، جھومر جھلنیوں والیاں اور ساری بلاؤس والیاں موت
کی آڑ میں تفریح کر رہی تھیں کہیں زیور کا چرچا تھا، کہیں لباس کا، کسی جگہ جلسوں کے
مذکور تھے تو کسی جگہ اخباروں کے۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں، حقیقی رنج جو اس مجمع کا مقصود
تھا ایک چہرہ پر بھی نہ تھا۔ ہاں کوئی حصہ کا طلبگار تھا کوئی اجازت کا خواستگار پھولوں کا
میلہ اس دھوم دھام سے منایا گیا کہ محلہ بھر میں واہ واہ ہو گئی۔ منشر کہ سانپ کی طرح
مسروے دے پٹک رہی تھی، بڑی مصیبت اس کا کو ارپنہ تھا جس نے منہ پر قفل لگا دیا تھا۔

سوچتے سوچتے اس کی سمجھ میں ایک یہ تدبیر آئی کہ گھر والی بیوی سے کہا کہ "مردانہ میں فاتحہ ہو چکی، اگر زنانہ میں بھی ہو جائے تو سبحان اللہ۔ اجازت ہو تو بی بی زبیدہ خاتون واعظ کو بلا لوں، لوگ بھی مستفید ہو جائیں گے اور مرحوم کی روح کو بھی ثواب پہنچ جائیگا" نیک بات تھی انکار کون کر سکتا تھا۔ زبیدہ بی بی بلائی گئیں۔ وعظ ہو چکا تو مشترکہ کھڑی ہوئی۔ یہ اس کا ابتدائی موقعہ اور پہلا اتفاق تھا، شرم بھی تھی، حیا بھی، خوف بھی تھا رعب بھی۔ مگر صبح کی بھوکی پیاسی، جوش میں بھری ہوئی کہنے لگی :-

"آج کا یہ جلسہ اب ختم کے قریب ہے۔ لیکن مہمان بیویاں اگر غور کریں تو اس مجمع کا ہر ذرہ اس کتاب کا ہر حرف اور ان پھولوں کی ہر پنکھڑی ہمارے واسطے ایک عبرت انگیز سبق ہے میں پھولوں کا جلسہ کہہ رہی ہوں اور بہت درست کہہ رہی ہوں۔ اس سے بہتر شادی کی محفل۔ اس سے زیادہ چہل پہل کا منظر، اس سے زیادہ پُر لطف مجمع اور کیا ہو سکتا ہے۔ جہاں ہر عورت نے نہایت اطمینان اور بے فکری سے اس لئے ایک گھر میں کھانا کھایا کہ وہاں موت ہو گئی۔ مدتوں کی بچھڑی بہنیں اس بہانے سے مل گئیں اور برسوں کی روٹھی ہوئی سہیلیاں اس سلسلہ میں من گئیں۔ اعلیٰ قسم کے کھانے یہاں موجود تھے۔ انگیٹھیاں یہاں روشن تھیں، پھر نہیں معلوم جلسوں میں اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے لیکن میں اپنی عزیز بہنوں، پیاری سہیلیوں، محترم ماؤں اور بزرگ نانی دادیوں سے یہ پوچھنے کا حق رکھتی ہوں کہ ان کے یہاں تشریف لانے کی وجہ کیا تھی۔ اگر ہمدردی تھی تو وہ جب جی چاہتا تشریف لاتیں آج ہی کے دن کیا خصوصیت تھی اور اگر آج ہی آنا لازمی تھا تو کتنی بیبیوں نے واقعی اظہار ہمدردی کیا؟ کیا منہ پہ کپڑا ڈال کر گیدڑ کی بولی بولنا ہمدردی ہے؟ کیوں بہنوں اور ماؤں کیا ہمدردی اسی کا نام ہے کہ جس گھر میں موت ہو وہاں ہمدردی کے لئے آؤ، اور دنیا بھر کے مسئلے طے کرو؟ کیا مسلمانوں کا اب یہ شیوہ رہ گیا ہے کہ وہ گدوں کی طرح جو زخمی اور بیمار جانور کو دور سے بیٹھے اس اُمید پر تاکتے ہیں کہ کب اس کا دم نکلے اور چٹ کریں، عزیزوں کی موت کے منتظر رہیں اور جب یہ خوشخبری ان کو پہنچے تو سب کام چھوڑ چھاڑ ہاتھ

دھوم دھڑلا موجود ہوں اور انواع و اقسام کے کھانے اڑائیں۔ اسلام جیسا سچا مذہب جس کا سکہ تمام دنیا پر بیٹھ گیا، جس نے دنیا کو دہلا دیا، آج اس کے پیرو ایسے ذلیل اور رذیل ہو جائیں!!

اسلام کا جس قدر رونا رویا جا رہا ہے، مسلمانوں پر جو جو مصیبتیں آ رہی ہیں، قوم کی جیسی جیسی مٹی پلید ہو رہی ہے، اس کے ذمہ دار ہم ہیں۔ ہم اگر اپنی کمزوریوں سے باخبر، اپنی خرابیوں سے واقف اور اپنے نقائص سے آگاہ ہو جائیں اور علاج کریں، سمجھ جائیں اور تدارک کریں تو یہ رسوم کے اٹل پہاڑ جو اس وقت ہمارے گھروں میں قدم جمائے کھڑے ہیں اور جو ہماری زندگی کے ساتھ لازم و ملزوم ہو گئے، چند ہی روز میں اکھڑ جاتے ہیں۔ اگر ہم اس غیرت کو جو ہم سے ہزاروں کوس دور ہو گئی ہے، اس حمیت کو جس کا آج ہم میں پتہ نہیں، دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کریں تو ہم وہی ہو جاتے ہیں جو تھے اور وہی ہوں گے جن پر زمانہ فخر اور جہان ناز کر رہا تھا، لیکن جس وقت ہم پھولوں اور تیجوں کی روٹیاں، بیسویں اور چالیسویں کے کھانے ڈٹ ڈٹ کر کھاتے ہیں، اس وقت ہم سے زیادہ بے غیرت اور ہم سے بڑھ کر بے شرم، ہم سے کھلا ہوا بے ایمان کون ہو سکتا ہے؟

میری عزیز بہنو! میری محترم بیویو! میری بزرگ خاتونو! معاف کرنا مگر بتانا ضرور، آخر کس جرم میں، کس قصور میں، کس غلطی میں، صاحبِ میت پر ہمارا کھانا فرض ہو گیا؟" وہ ہماری خاطر کرے۔ مردے کو بھول جائے، اور ہماری آؤ بھگت میں فرق نہ آنے دے۔ میں دریافت کرتی ہوں اور مجھے یہ حق ہے کہ دریافت کروں کہ کیا مسلمانوں کی پہچان، صداقت کی علامت، اسلام کا انجام یہی تھا؟ ایک عورت بیوہ ہوتی ہے، اس کا سہاگ لٹ جاتا ہے، اس کا عیش ختم ہو جاتا ہے اس کی زندگی برباد ہوتی ہے، اس کے بچے یتیم ہوتے ہیں، ایک سر دھرا اٹھ جاتا ہے، اس کا خاندان تباہ ہو، اس کا گھر بے چراغ ہو، اس کے بچے بے وارث ہوں، ایک نامرتی ہے اس کے بچے ایسی نعمت سے محروم ہوتے ہیں جو ان کو کبھی میسر نہ آئے گی، اس کے شوہر کا گھر ویران ہوتا ہے اور وہ ان بچوں کی جن کی دیوانی تھی ان صورتوں کو جن کی عاشقِ زار تھی، سوتیلی ما کے واسطے چھوڑ جاتی ہے، ایک بچہ مرتا ہے ماں باپوں پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا، ماں کی گود اجڑ گئی باپ

کا گھر تاراج ہو گیا ارمان اور اُمیدیں جو مدت سے دل میں پل رہی تھیں چشم زدن میں منقطع ہو گئیں ان موقعوں پر ان مصیبتوں پر ان بدنصیبوں پر ان مصیبت ماروں سے آپ کیا کرتی ہیں؟ آپ کی ہمدردی کیا ہے؟ بریانی کھلوائیے۔ متنجن دلوائیے! قورمے اڑوائیے، فیرنی پکوائیے، آپ انسان ہیں آپ کی عقل سلیم آپ کے ہوش ٹھکانے آپ کے حواس درست مگر آپ کے فعل دیوانوں کے، آپ کے گُن وحشیوں کے آپ کے کام سودائیوں کے، اور آپ کی توقعات پاگلوں کی! میں چاہتی ہوں کہ ذرا ان دلوں کو دیکھوں وہ کون سے دل ہیں جو ان کھانوں کو کھا سکتے ہیں ان آنکھوں کو دیکھوں جو یہ کھانے دیکھ سکتی ہیں۔ ان حلقوں کو دیکھوں جن سے یہ نوالے اُتر سکتے ہیں، ان صورتوں کو دیکھوں جو یہ حصے تقسیم کر سکتی ہیں، مگر میں سب کچھ دیکھ رہی ہوں اس سرے سے اُس سرے تک آپ سب موجود ہیں۔ تو کیا میں آپ سب کو مسلمان سمجھوں اور کہدوں کہ مسلمان کے یہی معنی ہیں اور اسلام اسی کا نام ہے۔ کیا ایک مسلمان وہ ہو سکتی ہے جو موت کا کھانا بآسانی کھا سکے۔

یہ مجمع اس لیے ہوا ہے کہ مولانائے مرحوم کی موت پر روئے اُن کے فراق ابدی پر افسوس کرے لیکن کتنی آنکھیں آج حقیقی آنسوؤں سے روئیں اور سچا افسوس کیا؟ ہم اس دنیا میں آزاد ہیں ہمارے اعضاء جسمانی کام کر رہے ہیں لیکن مرحوم کی پاک روح اس جگہ ہے۔ جہاں نہ ایسی دنیا ہے نہ ایسے لوگ۔ ان کے اعمال کا فیصلہ ان کے افعال کا نتیجہ وہاں ہوگا۔ وہ اس وقت ہمارے محتاج ہیں اور جو کچھ اُن کو پہنچائیں گے وہ اُن کو پہنچے گا۔ لیکن اس بھرے مجمع نے ان سینکڑوں بیویوں نے کتنے کلام اللہ کتنی سورتیں، کس قدر قرآن اور کتنا کھانا اُن کو پہنچایا؟ ضرورت تھی کہ آپ سب بیویاں، سب آج ہی نہیں دفعتاً فوقتاً اپنے اپنے پاس سے کھانے لے کر یہاں آتیں گھر والوں کو تسکین دیتیں اور کھانا کھلاتیں۔ نہ یہ کہ اور اپنے کھلانے کی آفت بھی اُن پر ڈال دی! صاحب خانہ کو اگر کھانا پکانا تھا تو یتیم خانے کے بچوں کو، رانڈوں کو، اپاہجوں کو جمع کرتے اور ان کو کھانا کھلاتے اگر کچھ روپیہ صرف کرنا تھا تو مسجدوں میں، مدرسوں میں انجمنوں میں یتیم خانوں میں بھیج دیتے۔"

مشرکہ کی تقریر اس قدر موثر ہوئی کہ سب بیویاں رونے لگیں اور اقرار کیا کہ

واقعی ان رسموں نے ہماری عزت و آبرو پر پانی پھیر دیا۔ مشرکہ نے اس اقرار پر بس نہیں کی بلکہ اُس نے اعلان کر دیا "اگر میری یہ التجا سب کو پسند ہے تو اسی وقت سب بہنیں آیندہ کے واسطے توبہ کریں اور قسم کھائیں کہ وہ موت کا کھانا نہ کھائیں گی۔ اور اگر وہ لکیر کے فقیر جو کسی طرح ان رسموں سے آزاد نہیں ہو سکتے، گھر بیٹھے حصے بھیجیں تو فوراً واپس کر دینگی اگر اس تجویز پر سب متفق ہوں تو ظاہر ہے کہ جب کوئی حصہ لینے والا اور کھانے والا نہ ہوگا۔ اس وقت کھانا بھی بیکار ہوگا اور نتیجہ یہ ہوگا کہ اس طرح یہ رسمیں نیست و نابود ہو جائینگی"۔

بیبیوں نے اس سے اتفاق کیا قسمیں کھائیں، اور عہد کئے کہ آیندہ سے نہ وہ پھولوں میں شریک ہوں گی نہ اس کھانے کو جائز سمجھیں گی۔

بائیسواں باب

بڑے میاں کی جائداد تقسیم ہونے کا وقت آیا تو ایک وصیت نامہ نکلا، جس میں پانسو روپیہ نقد اور ایک مکان مشرکہ کے واسطے لکھا ہوا تھا، جائداد کافی تھی، اولاد نے خوشی سے تعمیل کی اور اس طرح انعام اور ہاجرہ کرایہ کے مکان سے اُٹھ کر گھر کے مکان میں آ گئے۔ مشرکہ کی تقریر تمام شہر میں مشہور ہو چکی تھی، دُور دُور سے بیویاں کنواریاں اور بیاہیاں خورتیں اور بڑھیاں، اس کو دیکھنے اور ملنے آئیں۔ لڑکی ماشاء اللہ دسوں انگلیاں دسوں چراغ تھی۔ جو دیکھتا باغ باغ ہوتا، کنواری تھی سب کو تمنا ہوئی کہ مشرکہ ہماری بہو ہے۔ کوئی دن ایسا نہ جاتا کہ ایک آدھ پیغام یا دو چار آدمی اس سلسلے میں نہ آتے جاتے ہوں، اس لحاظ سے ہاجرہ اور انعام دونو خوش نصیب تھے کہ بڑے بڑے رئیس اور اچھے اچھے امیر مشرکہ کے گرویدہ تھے ورنہ اسی شہر اور شہر کیا محلے اور محلے ہی نہیں گلی میں کوئی خاندان کوئی کنبہ اور کوئی گھر ایسا نہ تھا جہاں کنوارے کوٹ نہ چھپنے ہوں۔ شادی آخر ہونی ہی تھی، ماں باپ کب تک انکار کرتے، ایک روز کا ذکر ہے کہ دوپہر کے وقت ادھر تو مشرکہ ظہر کی نماز سے فارغ ہوئی اُدھر رئیس حسن پور کی بیگم گھر میں آئیں ہاجرہ دیکھ تو پہلے

ہی چکی تھی۔ مگر اس وقت بیگم کا ٹھاٹ، ماماؤں کی چہل پہل، نوکروں کا شور و غل دیکھ اور سُن کر آنکھیں کھل گئیں۔ بیگم صاحب نے دو چار باتیں اِدھر اُدھر کی کیں اور پھر حرفِ مطلب زبان پر لے آئیں۔

"بوا میں تو بھیک مانگ رہی ہوں۔ دیکھو یہ جھولی پھیلی ہوئی ہے، اس میں ٹکڑا ڈال دیجیے کہ خوشی خوشی اپنے گھر چلی جاؤں۔"

ہاجرہ: "بیگم صاحب آپ مجھے کیوں شرمندہ کرتی ہیں، بھلا میں کس قابل ہوں کہ آپ کو کچھ دوں۔ یہ جو کچھ ہے آپ ہی کا طفیل ہے۔"

بیگم صاحب: "بس تو میری چیز مجھکو عنایت کیجیے۔ جب تک آپ کے پاس رہی، اب میری امانت میرے حوالے۔"

ہاجرہ: "یہ تو درست ہے مگر میں لڑکی کے والد سے بھی ذکر کر دوں، وہ جو کچھ کہیں گے عرض کر دوں گی۔"

بیگم صاحب: "ان کو جو کچھ کہنا ہو وہ آپ ہی کہہ لیجیے اور کہنا ہی کیا ہوگا۔ جب میں ہر شرط کے واسطے تیار اور ہر حکم کے واسطے آمادہ ہوں۔"

ہاجرہ: "جی نہیں شرطیں کیا ہوں گی۔ اس کا جواب کل عرض کر دوں گی۔"

اس قدر گفتگو کے بعد بیگم صاحب چلی گئیں، مگر صبح ہی ان کی ماما پھر آموجود ہوئی۔ آٹھ دن تک نوکروں نے مٹی ڈالی اور نویں دن جب ہاجرہ نے ہاں کہلا بھیجی ہے تو ذرا چین سے بیٹھیں اور ایک چار ہی دن گزرے ہوں گے کہ تاریخ مقرر کرنے کا تقاضہ شروع ہو گیا۔ مسلمان نکاح کو سنّت رسولؐ کہتے ہیں بلکہ سمجھتے ہیں لیکن نکاح کا قاعدہ زمانہ رسول اللہؐ میں بھی اور بعد کے مسلمانوں میں بھی یہ رہا کہ مرد کی طرف سے عورت کو یا اس کے ورثا کو پیغام نکاح پہنچا۔ خود رسول اللہؐ نے اپنے پیام اس طرح دیے ہیں۔ یہ پیام بر اتنا معتبر اور ایماندار ہوتا تھا کہ فریقین اس کے الفاظ پر پورا اعتماد رکھتے تھے۔

یہ دستور ہمارے یہاں پہنچ کر بگڑتے بگڑتے اب اس صورت میں ڈھل گیا کہ مشاطہ اور نائنیں، ڈومنیاں اور مامائیں اس فرض کو انجام دینے لگیں جس کا منشا صرف دونو کو کسی طرح رضامند کر کے اپنا معاوضہ وصول کرنا ہوتا ہے اور جو ایسے موقعوں پر جھوٹی امیدوں کے ایسے باغ دکھاتی ہیں جن کا قطعاً وجود نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ توقعات کے پورا نہ ہونے پر رنجش شروع ہو جاتی ہے اور اس طرح دونو زندگیاں تباہ و برباد ہو جاتی ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ مشرکہ ان جھگڑوں سے محفوظ رہی اور خود بیگم صاحب نے آکر معاملہ طے کر لیا۔ مگر ہاجرہ کی وہمی طبیعت، مراقی دل خالی خولی جانے والا نہ تھا، دن بھی مبارک ہو مہینہ بھی مبارک، ساعت بھی نیک ہو، پہر بھی نیک ہو۔ الغرض بہتیرے پاؤں پیٹے خاک نہ چلی۔ بیگم صاحب نے ہر چند عجلت کی مگر مطلق اثر نہ ہوا۔ سب ہی نے کوشش کی کہ ذیقعدہ کے مہینے میں نکاح ہو جائے مگر وہ اللہ کی بندی یہی رٹے گئی کہ نوج خالی کے چاند خدا دشمن کا بھی نکاح نہ کرے۔ ادھر اشد ضرورت یہ تھی کہ نواب صاحب بیت اللہ جانے کو تیار تھے چاہتے تھے کہ میرے سامنے لڑکے کا گھر آباد ہو جائے تو اطمینان سے روانہ ہو جاؤں مگر سب ہی جتن کر ڈالے وہ نیکبخت جس کا نام ہاجرہ تھا رضامند نہ ہونا تھا نہ ہوئی۔ بڑی خرابی یہ تھی کہ خود مشرکہ ان خیالات کی قطعاً پابند نہ تھی مگر اس کا معاملہ تھا، بول نہ سکتی تھی۔

تئیسواں باب

مس میری سمتھ نے جو اس وقت یہاں موجود تھیں اور جنھوں نے چار روز تک دن اور رات مشرکہ کی شادی کا ہر جزو کل دیکھنے کے بعد اپنی مشہور کتاب "مسلم خواتین کی شادیاں" لکھی، دل کھول کر مضحکہ اڑایا ہے اور حق یہ ہے کہ جو لکھا ہے سچ لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔ شادی کی کیفیت اس طرح لکھتی ہیں:۔

"میں جس وقت یہ کتاب لکھ رہی تھی، اس وقت اتفاق سے رئیس حسن پور کے لڑکے کی شادی تھی۔ دولہا والوں کا انتظام اُن کی رسمیں اور عقیدے میں اس سے پہلے بھی دیکھ چکی تھی۔ کلکٹر صاحب

کی سفارش سے مجھکو مسز انعام نے اپنے مکان میں ایک علیحدہ کمرہ چار روز کے واسطے دے دیا۔
یہ عورت یعنی مسز انعام، دلہن کی ماں مشرقی بہو بیٹیوں کا نمونہ تھی۔ مسلمان جو ہمارے سامنے بعض اوقات زور شور سے دعوے کرتے اور اسلام کی صداقت اور حق کی حمایت کے مدعی بنتے ہیں اُن کی اندرونی حالت دیکھ کر قلعی کھلتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ (نعوذ باللہ) اسلام کی اصلی تلقین یہ ہی تھی۔ اگر ہندوستان کے مسلمان ان واقعات کا بطلان نہیں کر سکتے تو یقیناً ان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اہلِ مذہب کے روبرو آنکھ ملا سکیں یا کسی ایسے شخص سے جو تثلیث کا معترف ہو مقابلہ کریں اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کا بڑا مذہب ہندوازم ہے اور گو اُن کے ہاں بھی پرستش کے بیشمار دیوتا موجود ہیں لیکن مسلم خواتین کے خدا زمین کے ہر ذرے سے پیدا ہوتے ہیں۔ شادی سے ایک روز قبل دولہا والوں نے دریافت کیا کہ "بری کس قدر بھیجیں" بری کھانڈ کے کچھ کوزے، کھوپرا، پستے، بادام۔ وغیرہ ہوتے ہیں جس کے جواب میں دلہن والے ہنڈیاں بھیجتے ہیں۔ ہنڈیاں ایک قسم کی گھی ملی ہوئی کھانڈ ہوتی ہے جس کو نہایت ہی میلے کچیلے حلوائی مٹھیوں میں بھینچ بھینچ کر گول بناتے ہیں، دلہن کی وداع سے ایک روز قبل معلوم ہوا کہ آج دولہا والے ساچق بھیجیں گے۔ اس ساچق کا کوئی وقت مقرر نہ تھا رات کے گیارہ بجے سفید مٹی کی چار گھڑیاں جن پر نقش و نگار تھے اور ابرک چھڑکی ہوئی تھی شربت اور پانی سے بھری ہوئی آئیں تاکہ دلہن ٹھنڈی اور میٹھی یعنی خوش و خرم رہے۔ اس کے بعد ایک خوان میں دلہن کی آرائش کا بہت سا سامان تھا۔ ایک لمبی سی چیز سہاگ پڑہ کہلاتا تھا کچھ کلاوے تھے، دلہن کی جوتی تھی اور اس کے کپڑے تھے جو ریت کا جوڑا کہا گیا تھا۔ یہ ریت کا جوڑا بالکل ویسا ہی تھا جیسا ہمارے یہاں مردے کو کفن دیا جاتا ہے۔ مصری کے کوزے تھے، پان کے بیڑے تھے، کھانڈ کی پڑیاں تھیں، مگر ان کی ضرورت میری سمجھ میں مطلق نہ آسکی۔ لال دھاگے جو کلاوے کے نام سے مشہور تھے اور جن سے زیادہ لغو چیز اس خوان میں کوئی نہ تھی، سنا گیا کہ کنبہ میں تقسیم ہونگے۔ اس جشن کو دولہا کی شخصیت سے کوئی واسطہ نہ تھا، رات کے دو بجے دلہن، دولہا کے چند عزیزوں کے حصہ میں آئی جو اس کی مائیں بہنیں تھیں اور جنہوں نے نہایت لغویت سے اُس کے مُنہ میں پان کے بیڑے اور مصری کی

ڈلیاں ٹھونسنی شروع کیں۔ اگر خوش قسمتی سے اس وقت اُس کے منہ پر رومال نہ ہوتا تو یقیناً مصری کی ڈلیاں اس کے رخسار کو کپّا کر دیتیں اور وہ "بہار اُچیک" معلوم ہوتی۔ موسم گرم تھا ہُوا بالکل بند تھی اور ایک معصوم لڑکی کو گوٹے ٹھپّے کے کپڑوں میں لدی ہوئی جس کے خیال سے مجھکو تکلیف ہوتی ہے اس طرح جھکی ہوئی بیٹھی تھی کہ اس کے چاروں طرف بیسیوں عورتوں کا مجمع تھا ہوا کا گذر مطلق نہ ہو سکتا تھا۔ مجھے تعجب تھا کہ وہ گھٹنے ٹیکے کس طرح اس آفت کو برداشت کر رہی ہے اور اُٹھ کر بھاگ نہیں جاتی۔ اس سے زیادہ تعجب اُن عورتوں پر تھا جو سمدھنیں کہلائی جا رہی تھیں مگر اُٹھنے کا نام نہ لیتی تھیں کہ دُلہن اُن کے پنجۂ ظلم سے نجات پائے۔

مشترکہ کو میرا یہ احسان ہمیشہ یاد رکھنا چاہئیے کہ میں نے اس ضرورت پر توجہ کی اور اُس کو ان تکلیفوں سے نجات دلوائی۔ دوسرے روز کا جشن برات کے نام سے مشہور تھا۔ مرد اور دولہا باہر تھے عورتیں اور دلہن اندر۔ جب نکاح ہو چکا ہے تو ایک گلاس میں شربت اور برف دولہا کے واسطے باہر بھیجا گیا جس میں سے نصف اُس نے خود پیا اور نصف چھوڑ دیا، یہ اندر آیا دلہن کو پلایا گیا۔ میں تو اس کے معنی یہی سمجھتی ہوں کہ دُلہن نے اس کا جھوٹا شربت پی کر اپنے محکوم ہونے کا اعتراف کیا۔ اس کے بعد دولھا اندر بلا گیا اور دُلہن ایک مٹی کے ڈھیر کی طرح اس کے سامنے بٹھا دی گئی عورتوں کے ٹھٹ ٹھٹ کے چاروں طرف لگے ہوئے تھے، چونکہ ان میں اکثر عورتیں دولھا سے پردہ کرنے والیاں تھیں۔ اس لئے دولھا کا اخلاقی فرض تھا کہ وہ نگاہ اونچی نہ کرے بلکہ نیچی گردن کئے بیٹھا رہے۔ آفتاب اس وقت پوری جوانی پر تھا اور دھوپ تلوار کا کام کر رہی تھی۔ کوئی چہرہ ایسا نہ تھا جو پسینوں میں نہ ڈوب رہا ہو۔ باوجود اس کے جو کچھ یہاں سب کی موجودگی میں کیا گیا وہ طویل ہونے کے علاوہ نہایت ہی لغو و فضول تھا۔ ہر رسم بتا رہی تھی کہ مسلمانوں کا دعویٰ توحید کہاں تک حق بجانب ہے۔ یہ رسمیں قریب قریب ہندوستان کے تمام مسلمانوں میں رائج ہیں۔ اس خاص رسم کا نام آرسی مصحف ہے جس کے تحت میں بیسیوں شعبدے جو نہایت پُر لطف ہیں اور جو مسلمانوں کی حالت کا کافی ثبوت ہیں دیکھنے میں آتے ہیں۔ جب وداع کا وقت آیا تو دولھا نے دلھن کو گود

میں اٹھایا اور سب کے روبرو پالکی میں بیجا کر بیٹھا دیا۔ سسرال پہنچنے پر دلہن کے پاؤں دولہا نے دودھ سے دھوئے تاکہ دلہن دودوں نہائے اور پوتوں پھلے۔ یہاں بھی رسوم کی کچھ کمی نہ تھی مگر سب سے پُرلطف وہ رسم تھی کہ دُلہن گڑیا بنی بیچ میں بیٹھی اور زبین عورتوں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ اس کی ہتھیلی پر تھوڑی سی کھیر رکھی، اور دولہا سے جو گڈے کی طرح بیٹھا ہوا تھا کہا "کھاؤ" جس وقت دولہا کھیر کھانے کو جھکتا تھا عورتوں میں سے کوئی نہ کوئی کھیر کھا جاتی تھی اور وہ غریب شرمندہ ہو کر رہ جاتا تھا"

چوبیسواں باب

بچپن کا حال تو خدا جانے یا اس کے ماباپ کہ کیا کیا غضب ڈھائے اور کیسے ستم توڑے ہوں گے، مگر ہوش سنبھالنے کے بعد سے یا یوں کہو کہ پالکی سے کھٹولی، عروس سے میت اور دلہن پن سے دم واپسیں تک ہاجرہ کے جتنے حالات ہم کو معلوم ہوئے ایک سے ایک اعلیٰ ہیں۔ بہو بنی تو ایسی بدنصیب کہ ساس سسرے دونوں کو چٹ کر کے چھوڑا، بیوی بنی تو اتنی بدتمیز کہ میاں کو بھیک منگوا کر بھی بس نہ کی، ماں بنی تو اس قدر ظالم ایک چھوڑ دو معصوم پُرانی رسموں اور کچے عقیدوں پر قربان کر دیئے۔ اب بیٹی بیاہنے کا وقت آیا تو عقل کی ہیٹی نے پوچھا نہ گچھا، سوچا نہ سمجھا دولت پر جبر غش ہو کر ایسی لٹو ہوئی کہ میاں کو شیشہ میں اتار چٹ ہاں کر لی۔ مختصر کہ سسرال پہنچی تو کیا دیکھتی ہے کہ مرد، عورت تو درکنار بچہ بچہ اور پتہ پتہ شرک میں ڈوبا اور پیر پرستی میں شرابور ہے۔ نواب صاحب اور بیگم صاحبہ تو فقط نام ہے کام سارا پیر جی کے ہاتھ میں ہے۔ باہر کے کام تو خیر دیکھے وہ تھے حلیہ ہے کہ زنانے کے بھی جو کام تھے اس میں پیر جی کا دخل اور پیر جی کی صلاح۔ نکاح ہوا تو پیر جی کی اجازت سے چڑھا دا چڑھا تو پیر جی کے مشورے سے۔ پیر جی کیا نعوذ باللہ گھر کے خدا تھے، خاندان کا ہر متنفس ان کا شیدا اور گرویدہ تھا۔ مختصر یہ کہ تمام آفتیں بھگت چکی تھی۔ سسرال کے یہ رنگ دیکھ کر اور ساس سسروں کے یہ ڈھنگ سن کر اس کے سوا کر ہی کیا سکتی کہ دل ہی دل میں منہ پیٹ لیا۔ جب رونمائی کا موقعہ آیا ہے تو گو لاکھ دلہن تھی مگر کان اور

آنکھیں موجود تھیں زبان خاموش تھی مگر جو کہا جاتا تھا، وہ سنتی تھی جو ہوتا تھا وہ دیکھتی تھی۔ پیرجی کا سلام اس کو ایک آنکھ نہ بھایا مگر کر کیا سکتی تھی۔ نیا گھر، اجنبی لوگ پہلا موقع رضا بہ قضا گئی اور سلام کیا۔ پیرجی بھی بچّہ نہ تھے پیشانی کا بل اور چہرہ کا رنگ دیکھ کر صاف سمجھ گئے کہ لڑکی موبل نہیں سمجھدار ہے۔ دعا دی، سر پر ہاتھ پھیرا دم کیا پڑھ کر پھونکا، لطف یہ تھا کہ بڑھیاں تو خیر اپنی عمریں طے کر چلی تھیں، لڑکیاں اور جوانیں بھی آزادانہ پیرجی کے سامنے ہوتی تھیں۔ سارا گھر اُن کا کلمہ پڑھتا تھا۔ نماز ٹل جائے روزہ نہ ہو، مگر ان کے ارشاد میں فرق نہیں آسکتا تھا۔ نواب صاحب کا حکم ٹل جائے لڑکے کی بات پوری نہ ہو لیکن جو بات پیرجی کے منہ سے نکل جائے یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کی تعمیل نہ ہو۔ رعب اتنا کہ سب ہاتھ باندھے سامنے کھڑے رہتے، اثر اس قدر کہ گوشت میں ترکاری پڑتی تو پیرجی کی اجازت سے اور سالن میں گھی پڑتا تو ان سے پوچھ کر، ظالم باہر سے اندر تک اور مرد سے عورت تک ہر چیز پر اور ہر شخص پر اس طرح چھایا ہوا تھا کہ خدا کی پناہ! آدمی کیا نواب صاحب کے گھر کا خدا تھا کہ سب اُس کی پرستش کرتے اور وہ جائز رکھتا، مرد اُس کے ہاتھ چومتے اور عورتیں اُس کے پاؤں دباتیں اور بچے اُس کی مٹھیاں بھرتے، اچھے سے اچھا کھاتا اور بہتر سے بہتر پہنتا۔

منشر کہ بچہ، ناتجربہ کار، سیدھی بھولی، سب کچھ ہی مگر باخبر تھی اس جوئے سے جو نکاح نے اس کے کندھوں پر رکھا، واقف تھی اس تعبیر سے جس نے کنوار پنے کی بے فکری کا خواب ختم کر کے ذمہ داری کا بار اس کے سر پر رکھ دیا۔ وہ اس بوجھ کی سہار کو قطعاً تیار تھی لیکن جو آثار نمودار ہوئے وہ اس کا خون خشک کر رہے تھے، وہ شوہر کی عظمت، ساس سسروں کی وقعت، اور سسرال والوں کی تمکنت خوب سمجھتی تھی، اور جانتی تھی کہ پرائے دل پر قبضہ کرنا آسان اور غیر شخص کو اپنا کرنا سہل نہیں، سرمہ بن کر آنکھوں میں اور کندن بن کر گلے میں پڑنا ہے۔ اپنی طرف سے اطاعت میں کسر نہ کی، شوہر کو کھانا اس نے کھلایا، ساس کا سر اُس نے دبایا، سسرے کو پنکھا اُس نے جھلا مگر اس کا کیا علاج کہ پیرجی کی رضامندی سے

بغیر یہ اطاعت، یہ خدمت بیکار اور یہ ریاضت بے سود تھی۔ سر سے کنواں کھودتی اور کھال کی جوتیاں پہناتی مگر سب اکارت تھا۔ آٹھ ہی روز نکاح کو گزرے ہوں گے کہ میاں نے کہا۔

”تم حضور کی خدمت میں کبھی حاضر نہیں ہوئیں۔ دو ہر مرتبہ ابا جان اور کئی دفعہ بیوی نے بھی کہا ایسی خود سری بھی کس کام کی۔ ایک دنیا اُن کی گرویدہ اور سارا شہر اُن کا مشتاق ہے ہمارے ایسے نصیب کہاں کہ وہ ہم سے بات بھی کر لیں۔ دنیا اُن کے قدموں پر آنکھیں بچھانے کو تیار ہے، تم ایسی بدنصیب ہو کہ یہ برکت گھر بیٹھے خدا نے دی اور تم محروم ہو۔“

مشرکہ میاں کی تقریر سُن کر خاموش ہو گئی۔ ارادہ کیا کہ جواب دوں مگر مصلحت نے بھی طبیعت پر جبر کیا، دل پہ ظلم، زبان روکی، منہ بند کیا اور صرف اتنا کہا ”بہت اچھا“

شوہر: ”میں بھی حضور کی خدمت میں جا رہا ہوں تم سب کام چھوڑ چھاڑ سیدھی وہیں آؤ“

دل مانتا نہ تھا، نفس گوارا نہ کرتا تھا، طبیعت روا نہ رکھتی تھی، مگر زنجیر نکاح اپنی صلاح پر غالب رہی۔ بالجبر و بالاستکراہ اٹھی اور پہنچ گئی، بیٹھی، مگر بیٹھنا کیا، بظاہر فرحت بباطن مصیبت، زبان پر حضور دل میں لعنت۔

پیر جی پہلے ہی دن سمجھ گئے تھے کہ پکے وہابیوں کی لڑکی ہے مشکل سے جال میں پھنسے گی اس پر طرہ یہ کہ آٹھ دن کا اکٹھا غوط تھا، سارا گھر، بڑا اور چھوٹا مرد اور عورت نماز سے پہلے سلام کو حاضر ہو، اور نہ ہو تو وہی نافرمان جس نے پیر جی کی زبان سے ایمان کی پتلی کو کافر اور بے ایمان کا لقب دلوایا۔ مجبوری کا جانا زبردستی کا بیٹھنا، اس پر دلہن بنی ہوئی اپنی طرف سے کیا پہل کرتی پیر صاحب کچھ فرماتے جواب دیتی، بدنصیب شوہر کا حکم سنتے ہی حاضر ہو گئی۔ اب پیر جی کی یہ توقع کہ آتے ہی پاؤں میں گر پڑتی اور شوہر کی یہ اُمید کہ چھوٹتے ہی ہاتھ چوم سر آنکھوں پر رکھ لیتی، واقعی وہ پورا نہ کر سکی اور جہاں تک ہمارا خیال ہے وہ پورا بھی نہ کر سکتی تھی۔ دو چار لمحہ بعد خود ہی پیر جی نے کہہ دیا کہ ”جاؤ بے ایمان کا یہاں کام نہیں“۔ پیر جی کا فرمان قرآن کی آیت یا رسول کا فرمان کہ سُنتے ہی سب سناٹے میں رہ گئے اور کہا ”جاؤ سامنے سے ہٹ جاؤ“۔

پچیسواں باب

یہ بھی خدا کی شان تھی کہ پانچوں وقت کی نماز اور دو دو وقت کی قرآن پڑھنے والی لڑکی اُن لوگوں کی نگاہ میں جو کبھی بھول کر بھی خدا کو سجدہ نہ کریں بے ایمان ٹھہرے، اور صرف اس لئے کہ مسلمان رہے اور مسلمان رہنا چاہتی ہے مسلمانوں کے ہاتھوں ایسی ذلیل ہو کہ نوکروں کے بعد ماماؤں سے بدتر جانوروں کے ساتھ بھنگیوں کی طرح اُس کی روٹی بھجوا دی جاتی۔ ساس سسر بات نہ کریں، شوہر آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھے۔ مامائیں طعن کریں لونڈیاں آوازے کسیں اور وہ شہد کے قطروں اور شربت کے گھونٹوں کی طرح سب کو پی جائے پورے دو سال اسی طرح گزرے اور اب مشرکہ شوہر کی بیوی اور ساس کی بہو ہونے کے علاوہ اُس بچہ کی ماں بھی تھی جو پیدا ہوتے ہی پیرجی کے قدموں میں ڈالا گیا۔ مشرکہ تو آٹھ ہی دن بعد سے ایسی نحس اور منحوس مشہور ہو گئی کہ کوئی بیماری آئی تو اس کی نحستی، کوئی دکھ ہوتا تو اس کا اثر سوا پہر دن چڑھے تک حکم نہ تھا کہ انگنائی میں نکل سکے، ایسا نہ ہو صبح ہی صبح اُس کے چہرے پر کسی کی نظر پڑ جائے ہم اسی کو غنیمت سمجھتے ہیں کہ اس کی بے ایمانی اور نحستی کا بچہ پر کوئی اثر نہ پڑا۔ ٹوٹا باسن کبھیرے کے سر، جب بچہ بیمار پڑتا تو البتہ ماں کے سپرد ہوتا ورنہ دن رات دادا دادی اور نوکر ماماؤں کی گود میں رہتا، دودھ کے واسطے ماں کے پاس آتا، اِدھر آیا اُدھر طلبی کا تقاضا موجود یہ بھی پیرجی کا حکم تھا کہ ماں کی تربیت کا زیادہ اثر نہ پڑے۔

پیرجی کو پورا یقین تھا کہ مشرکہ کو ایک ہی ڈانٹ جہنم واصل کر دے گی۔ عورت ہے اور عورت بھی سمجھدار نہیں، لڑکی اور لڑکی بھی کچی لکڑی، اس کا جھک جانا زیادہ مشکل نہیں۔ ہر طرف کی پھٹکار، چوطرف کی جھک جھک اور پٹ پٹ، ہر وقت کی اذیت، ہر لمحہ کی لعنت، طبیعت کے بل نکلنے کے بنے نکال دے گی۔ اس کی تو ہستی کیا ہے کہ اکڑ سکے۔ ایک ہی مار ایسی پڑے گی کہ سارے خنے ٹھیک ہو جائیں گے۔ تو بھی اس کے ساتھ ماں اور باپ دونوں سے سجدہ کرواؤں مگر پیرجی کا خیال غلط توقع جھوٹی، اور امید فضول تھی، بڑے میاں کی صحبت،

اس کی طبیعت پارس اور صورت کندن بنا گئی تھی اُس نے مصیبت کو راحت اور آفت کو غنیمت سمجھا، روکھی کھائی اور خوش رہی، پرانا پہنا اور شکر کیا۔ اس میں شک نہیں کہ شوہر کی نفرت اور ساس کی عداوت بہارِ زندگی کا خاتمہ اور گلشنِ حیات کی ایسی بربادی تھی جس کی تلافی قطعاً ناممکن تھی لیکن توحید اُس کے رگ و پے میں اور اسلام اس کے خون میں سرایت کر چکا تھا۔ اس نے جو آئی وہ اٹھائی، جو پڑی وہ جھیلی، مگر زبان پر شکایت اور دل میں میل نہ آنے دیا۔ ہاجرہ سگی ما اور انعام حقیقی باپ تھا لیکن کیا مجال جو ان دونوں کو رتی بھر پتہ لگنے دیا ہو۔ کھانے پینے کے دن اور پہننے اوڑھنے کا وقت تھا، آدمی تھی اور دیکھتی تھی کہ بڑھیا ساس منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت گوندنی کی طرح زیور میں لدی بیٹھی ہیں دونو وقت سفید بگلہ سر گندھ رہا ہے قیمتی سے قیمتی اور اچھے سے اچھا کپڑا پہن رہی ہیں اور بگھاڑ رہی ہیں، مگر کیا مجال جو دل میں خیال یا زبان پر ملال آجائے۔ سہتی اور چپ رہتی اور اُف نہ کرتی۔ لڑکی تھی، جوان تھی، دل میں ارمان تھا، منہ تھا منہ میں زبان تھی، مگر توبہ توبہ جو مل گیا وہ پہن لیا۔ جو آگیا وہ کھا لیا۔ دل کی وہ کلی جو شگفتہ ہو کر ایک عالم کو مہکاتی کھلتے ہی مرجھا گئی جس دماغ سے بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں اُس پر ایسی اوس پڑی کہ صرف خدا کے شکر کے کام کا رہ گیا۔ اس حالت پر بھی اس نیک بچی نے اپنے فرائض ادا کرنے میں کمی نہ کی۔ ظالم شوہر دن دن بھر اور رات رات بھر مردانہ میں گلچھرے اڑاتا اور کبھی بھول کر بھی بیوی کے پاس نہ پھٹکتا مگر جب کبھی بھولے بسرے آنکلتا تو لونڈیوں کی طرح کھڑی ہو جاتی پنکھا جھلتی، کپڑے اُتارتی، ہاتھ دُھلاتی پاؤں دُھلاتی حسن پور والے اس مردود کے مرید اگر مشہ رکھ کے برخلاف قرآن اُٹھالیں تو جھوٹے۔ زندہ ہیں ابھی وہ آنکھیں جن کے سامنے پورے چار پہر کی رات پاؤں دباتے اور پنکھا جھلتے اس مظلومہ کی آنکھوں میں کٹ گئی اور اذان کے ساتھ کلمہ توحید پڑھتی ہوئی وضو کو اٹھ کھڑی ہوئی وہ معاوضہ خدمت کی طلبگار تھی نہ رحم و کرم کی خواستگار۔ خواہش تھی تو اتنی ارمان تھا تو یہ

کہ اسلام اس کا شوہر اس سے سیدھے مُنہ بات کرے راتیں اس ارمان میں اور دن اس آرزو میں پورے ہوتے مگر خواہش اور ارمان پورے نہ ہوئے ھاجرہ لاکھ واقعات سے بے خبر اور مصیبت سے نا آشنا تھی مگر ماں تھی، عمر کا تجربہ، زمانہ دیکھے ہوئے، شوہر کا ڈھنگ برتتے ہوئے مشرکہ کے تیور سے صاف پہچان گئی کہ دال میں کالا ہے۔ کئی دفعہ منہ پر رکھا بار بار پوچھا، بہلا کر، چمکار کر، محبت سے، دھوکہ سے، نرمی سے، غصے سے، مگر وہ اللہ کی بندی ٹس سے مس نہ ہوئی جب کہا یہی کہا "اللہ کا شکر ہے مجھے کوئی شکایت نہیں" لیکن ھاجرہ کی مامتا تھی، کلیجہ کو لگی ہوئی ایک روز آؤ دیکھا نہ تاؤ ڈولی کی اسی دھن میں بیٹی کے ہاں پہنچی۔ جانے کو ھاجرہ چلی گئی مگر وہاں پہنچکر دیکھتی ہے کہ سمدھن کے وہ رنگ ہیں نہ داماد کے وہ ڈھنگ۔ بیٹی ہے وہ گم سم، چپ چاپ ایک گھر میں قیدیوں کی طرح پڑی ہے۔ دنگ رہ گئی۔ وہی بیگم صاحب جن کا بیوی بیوی کہتے مُنہ خشک ہو رہا تھا پاس آکر بھی نہ پھٹکیں اُس کی چنداں شکایت نہیں پھر غیر تھیں۔ افسوس اس سنگ دل داماد کا ہے جو ساس کے سلام تک کو نہ آیا۔

ھاجرہ پھیلی تو بہت اور اگر اس کا بس چلتا تو بچی کو ساتھ لے ڈولی منگوا کر کبھی کی چلتی ہوتی مگر مشرکہ نے اف نہ کرنے دی اور اُلٹے پاؤں ماں کو لوٹا دیا۔

مشرکہ کا پالا اگر کسی سمجھدار سے پڑتا تو داد کی مستحق تھی، مگر جہاں پیر اور مرید نورٌ علیٰ نور ہوں وہاں جو کچھ بھی ظہور میں آتا بجا۔ مقابلہ چیونٹی اور ہاتھی، بکری اور شیر، گائے اور قصائی کا تھا۔ کجا وہ جفا کار کہ زمین سے آسمان تک ہر متنفس اس کا کلمہ پڑھے، کجا یہ غریب خستہ خوار کہ پاؤں تلے کی چیونٹی بھی جان کی دشمن! دیکھنے میں سنگدل بالکل غافل اور قطعاً لاپروا تھا مگر مشرکہ کی یہ روش دیکھ کر دل ہی دل میں کھولا جاتا تھا۔ چاہیئے تھا کہ اس بدنصیب کو جس کی تمام اُمیدیں اور ارمان غارت ہو چکے تھے، خاک ملا، اطمینان سے بیٹھ جاتا، ہرگز نہیں جب موقع ملتا اور ذکر آتا تو ایک نہ ایک بات چبھتی ہوئی کہہ دیتا کہ ساس کی ساری کی کرائی محنت اور خدمت پر پانی پھر جائے۔ محرم کی اکیسویں تاریخ نورالدین شاہ کا عرس آیا۔ نواب صاحب

کے ہاں سے ہر سال دو ڈھائی ہزار کی چادر چڑھائی جاتی تھی اور سارا گھر تین دن تین رات وہیں حاضر رہتا تھا۔ عرس مشہور تھا۔ دُور دُور سے لوگ آتے تھے۔ مرد بن ٹھن کر عورتیں بہن اوڑھ کر چاروں طرف جھلاّتے جھلاّتے پھرتے تھے۔ عرس شروع تو انیسویں ہی سے ہوتا مگر اکیسویں یعنی آخر تاریخ کو نواب صاحب کی چادر چڑھتی۔ پہلے خود نواب صاحب اُس کے بعد بیگم صاحب اور پھر سب بال بچے جھک کر مزار کی پائینتی سجدہ کرتے اور وہ خاک اپنے منہ آنکھوں پر مل کر حاجت براری کی التجا کرتے۔ شاہ صاحب اپنے زمانۂ حیات میں نہایت قابل قدر بزرگ اور سچے اللہ والے تھے، مریدوں کی تعداد اُن کی زندگی میں بھی کچھ کم نہ تھی، مگر بوسہ اور سجدہ تو درکنار خدا غریق رحمت کرے اُنھوں نے عورت کا مصافحہ تک کبھی جائز نہ رکھا۔ ہاں اب ان کے نام سے اس عرس کی آڑ میں سیلانی زور شور کا میلا مناتے دھڑلّے سے رنڈیاں ناچتیں اور مزے سے بریانی متنجن اڑتے۔ پیر جی اچھی طرح جانتے تھے کہ منشر کا اس موقع سے صاف اکھڑ جائے گی، مگر اجازت طلب کی گئی کہ "بہو کے واسطے کیا حکم ہے" تو فرمایا "ہزار برس کی نبو ہے اسی کے ہاتھ سے چادر چڑھوا دو بچہ نے معاف کیا!"

مامائیں، مغلانیاں، انا، دادا، ساس، شوہر نہایت خوش، ہنستے ہوئے یہ مژدہ سُن کر پہنچے اور کہا "مبارک ہو! حضور نے قصور معاف کر دیا اور چادر چڑھانے کی اجازت تم کو دی۔" اوپر کا سانس اُوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ خفیف سی مُسکراہٹ اپنی بدنصیبی پر آئی اور دل نے فوراً گواہی دی کہ "یہ جو روکھا سوکھا ٹکڑا اور پرانا دھرانا چیتھڑا نصیب ہوتا ہے یہ بھی پیر جی صاحب کو گوارا نہ ہوا۔ نکاح میں آئی ہوں بیوی نہ سہی حق دار تو ہوں مجھے بے حق کرنے سے حاصل کیا، خیر خدا سب سے بہتر دارث ہے انجام بخیر ہو یہ وقت تو جوں توں کٹے ہی گا۔"

روانگی کا دن آیا تو ساس نے بھاری سا جوڑا نکال کر بہو کو بھیج دیا اور شوہر نے آ کر کہا "اب تم نہا کر کپڑے بدل لو۔ دو بجے ہم سب روانہ ہو جائیں گے۔" شوہر کا حکم تھا

نہ ٹالا، اُٹھی غسل خانہ میں گئی، نہائی، کپڑے بدلے، دِل پر جو گذر رہی تھی اس کو تو وہ خود ہی خوب سمجھ سکتی تھی، مگر بظاہر ہنسی خوشی سب کے ساتھ تھی۔ باجے کے ساتھ چادر چلی، پیش پیش پیر جی آگے چادر رکھے ہوئے، اُن کے پیچھے پیچھے گاڑیوں میں عورتیں، اُن کے پیچھے مرد۔ تین دن اور تین رات خوب جشن اُڑے۔ کھانے سے فارغ ہو کر جو بیویاں برائے نام برقعے اوڑھ باہر نکلیں تو دِن بھر خاک اُڑاتیں، کیسی بے پردگی اور کس کا لحاظ، کھوے سے کھوا بھڑتا اور سر سے سر ٹکراتا۔ مشرکہ موردِ غضب تو پہلے ہی روز ہو گئی تھی جب اُس نے ساتھ چلنے کو صاف جواب دے دیا، مگر چادر کے وقت کا انکار تو وہ جرم تھا جس نے بیشمار آدمیوں کے سامنے ہزاروں باتیں سنوا دیں۔ نابکار شوہر شرم و حیا طاق میں رکھ طلاق دینے پر آمادہ ہو گیا۔ البتّہ مہر کا سوال بڑھی کچھ تھا جس نے اس وقت بیکس کی لاج رکھ لی ورنہ بھرے مجمع میں رند چلتوں کے سامنے اور سیلانیوں کے روبرو اس کی عزت اترنے میں کوئی کسر نہ رہی۔ ایک کا غصّہ، ایک کی خفگی، ایک کی فضیحتی، ایک کی لعنت ہوتی تو خیر وہاں تو سارا کنبہ پوری محفل اور بھرا جلسہ لعنی کے طوق گلے میں ڈال رہا تھا۔ پیر جی تو صرف اتنا کہہ کر ہنستے ہوئے چلے گئے "مسلمان کی اولاد کافر" یہ فتویٰ ایسا نہ تھا کہ اُن کے مُرید سُنتے اور ٹال جاتے۔ اسی وقت اس کے ہاتھ کا کھانا پینا، اس کی صورت ہر چیز حرام ہو گئی۔ گھر چلنے کا وقت آیا تو مسلمانوں کو کیا ضرورت تھی کہ کافر کے ساتھ بیٹھتے اسباب کی ایک گاڑی میں اس کو جگہ ملی۔ پیر جی بہیلی میں، بیویاں پالکیوں میں، مرد گاڑیوں میں اور اسباب چھکڑوں میں لد چکا تھا۔ چلنے کی مارا مار ہو رہی تھی کہ مؤذن نے روزِ روشن کی وداع کے ساتھ مالکِ حقیقی کی وحدانیت کا ڈنکا بجایا۔ خلقت رخصت ہو گئی تھی۔ جنگل خاموش اور ہوا ساکن تھی۔ نعرۂ توحید اس زور سے ہوا میں گونجا کہ ہر لفظ مشرکہ کے کلیجے پر گر رہا تھا۔ عرقِ عبودیت پیشانی پر آیا، اُٹھی، وضو کیا اور نماز کو کھڑی ہو گئی۔ اس تاخیر سے اور بھی ذلّت ہوئی۔ نمازی مضحکہ اُڑا، دُعا پر ٹھٹّے لگے، دیر پر غصّہ ہوا، انتظار پر فضیحتیاں ہوئیں، رستے پر بوچھاڑ رہی اور گھر پہنچتے ہی یہ فیصلہ ہوا کہ "زنانہ کی طرف سے کمرہ کا دروازہ بند کر باہر کا دروازہ کھول دیا جائے"۔

چھبیسواں باب

سسرال سے جو تھوڑا بہت واسطہ تھا، اوّل تو وہ تھا ہی برائے نام لیکن اس عرس کی بدولت اور پیر جی کے طفیل وہ بھی انقطاع ہوا۔ اب اس کمرہ کو مقفل سمجھ کر چاہے حوالات کہو یا محلسرائے کے گوشہ میں ایک علیحدہ مکان سمجھو۔ واقعات یہ تھے کہ رات دن اکیلی پڑی رہتی دونوں وقت ماما آتی اور کتوں کی طرح روٹی دے جاتی، وہ بھی اس طرح کہ تیوری پر بل پیشانی پر غصہ دل میں بخار، زبان پر پھٹکار۔ شوہر کا وطیرہ یہاں پہلے سے بھی بدتر رہا، بیوی کے کان دن بھر شوہر کی آوازیں سنتے مگر آنکھیں پانچ پانچ چھ چھ روز صورت نہ دیکھتیں کبھی پانچویں چھٹے روز آیا گھڑی آدھ گھڑی بیٹھا، دس پانچ باتیں دو چار صلواتیں سنائیں اس کے بزرگوں کو بُرا بھلا کہہ سُن بڑوں کو چُن چُنا سیدھا ہو لیا، ہاں بچہ کے بہانے ماماؤں کے پھیرے دن بھر ہوتے رہتے تھے۔ رات کو جب بچہ سو جاتا تو اس کی کھلائی وہ بھی مشرکہ کے واسطے نہیں بچہ کے لئے یہاں سو رہتی اور اس طرح دل بہلانے یا غم غلط کرنے کا ایک ذریعہ یہ رہ گیا تھا جو اکیلی سے دوکیلی کر دیتی تھی ورنہ دن بھر مشرکہ تھی اور وہ حوالات کا کمرہ۔ مشرکہ کے اس صبر و استقلال کا نتیجہ تو بد تر ہی نکلا، مگر اس کی استقامت بہت سی طبیعتوں پر چپکے ہی چپکے اپنا اثر کر رہی تھی۔ جاڑے کے موسم میں جب کڑکڑاتی سردی پڑ رہی تھی صبح کی نماز کے وقت اور اُس وقت جب پیر جی اور سارا گھر نرم گرم بچھونوں پر دبکے سکڑے پڑے ہوتے تھے، اس کا اذان کے وقت اٹھنا اور ٹھنڈے برف پانی سے وضو کرنا معبود حقیقی کے حضور میں حاضر ہو جانا خالی خولی جانے والا نہ تھا۔ وہی مامائیں جو کل تک اُس سے بیزار تھیں چوری چھپے اس کی طرفدار ہو گئیں۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک روز کھلائی نے پیر جی کے سامنے اسرکلام سے صاف کہہ دیا کہ "ایسی صابر کی بیوی دیکھنے میں کیا سننے میں بھی نہیں آئی"۔ پیر جی اُس وقت تو بات ٹال گئے مگر تہ کو پہنچ کر سمجھ گئے کہ مشرکہ کے بیج رنگ لے آئے اور نہ معلوم یہ رنگ کس کس پر اثر ڈالے گا۔ کھلائی کا نکال باہر کرنا اس شخص کے واسطے جس نے بیوی کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال الگ کیا کچھ بڑی بات نہ تھی مگر

جانتا تھا کہ بچہ پلا ہوا ہے مفت میں بات جائے گی مشہور تو یہ تھا کہ پیر جی دنیا سے بیزار روپیہ سے متنفر گوشہ نشین بزرگ ہیں مگر کیفیت یہ تھی کہ مہینہ میں ایک آدھ دفعہ جب نواب صاحب اُن کی بیوی کے پاس جاتے دو تین سو روپیہ سے کم خدمت نہ کرتے۔ بیگم صاحب دوسرے تیسرے مہینے زیارت کو جاتیں، چار پانسو کا سلوک کرتیں۔ یہاں سے جو کچھ نذر نیاز عید بقرعید کا ہوتا اس کو بھی وہ ہاتھ نہ لگاتا سب گھر بھجوا دیا جاتا۔ آپ یہاں پڑا ہوا تھا اور ٹکے وہاں پہنچ رہے تھے۔ بجھو کا ٹھکانہ نہ تھا رہنے کا مکان وہ عالیشان کہ آسمان سے باتیں کرے، ٹھاٹ وہ امیرانہ کہ بیوی کے آگے ماما، بچوں پر کھلائیاں، غرض وہ پُرلطف زندگی اور شاندار جینا تھا کہ پانچوں گھی میں اور سر کڑھائی میں۔ نابکار کہلاتا تو دیندار رہتا مگر رات بھر افیون میں سرشار اور ہوس دنیا میں گرفتار۔ اس حیثیت اتنی وقعت اور ایسی عزت کا آدمی، مشترکہ اس کا مقابلہ کر ہی کیا کر سکتی تھی۔ سالس بندوں کی طرح سجدے کرتی اور خوش رہتی۔ مگر بڑے میاں کا فرمانا پتھر کی لکیر تھا جو دل پر نقش ہو گیا اور ایسا جما کہ کسی طرح نہ نکل سکا۔ جوانی کی امنگیں، زندگی کی بہاریں، دل کے ارمان، طبیعت کے جوش سب پر خاک ڈالی۔ ساس جیسی غمگسار کھوئی، شوہر جیسا رفیق کھویا، موتی جیسی آب کھوئی، عیش کھویا، مگر توحید کا مضبوط رشتہ ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ چھ ساڑھے چھ سال سے پیر جی یہاں رہتے تھے غصہ ناک پر اور مزاج آسمان پر۔ ذرا کوئی بات خلاف ہوئی اور بوریا بندھنا بندھا۔ پھر خوشامدوں کی یہ حد اور منتوں کی یہ انتہا کہ بچے کھڑے رو رہے ہیں نواب صاحب اور بیگم صاحب، کواریاں اور بیاہیاں ہاتھ باندھے حاضر ہیں، کوئی عفو قصور کا طالب کوئی رحم و کرم کا ملتجی مگر کمبخت ایسا شقی القلب تھا کہ ناکیں رگڑواتا پاؤں میں گرواتا جب کہیں غصہ فرو ہوتا۔ جانتا تھا کہ نواب صاحب کوئی دن کے مہمان ہیں لڑکا قبضہ میں اور بیگم جال میں پھنسی ہوئی ہے جس بل نچاؤں گا ناچیں گے۔ مگر مشترکہ کا کانٹا ایسا اگر پھنسا تھا کہ سانپ کی چھچھوندر بن گیا، اگلتے بنتی نہ نگلتے۔ ہاجرہ نے یوں تو عمر بھر بیوقوفیاں کیں مگر یہ ایک کام ہوشیاری کا بھی کیا کہ بیٹی کا مہر پچیس ہزار کا بندھوا لیا۔ دنیا لیتا کون ہے مگر نہ معلوم بیوقوف کو

کیا سوجھ گئی تھی کہ اس وقت یہ زنجیر اسلام اور پیرجی کے توڑے نہ ٹوٹ سکی۔

بچہ مشکل سے آٹھ مہینہ کا ہوگا کہ ایک روز شام کے وقت اسلام اس کو گود میں لے کر بیوی کے پاس آیا اور کہا "اس کو دودھ پلانے کی اجازت کل دوپہر تک کی اور ہے حضور نے فرمایا ہے کل ظہر کے وقت تک اس کا دودھ چھڑا دیا جائے۔ اماں جان یہاں آنا نہیں چاہتیں وہ دوائیاں جو لگائی جاتی ہیں لگا لینا، مگر دوپہر کے بعد ایک قطرہ بھی اس کو حرام ہے اماں جان نے منت مانی تھی کہ دودھ چھڑا کر نور الدین شاہ کے پائینتی ڈالوں گی۔ وہ کل شام کو چادر چڑھائیں گی، اگر تمہارا کفر دور ہو گیا ہو اور چلنا چاہو تو میں حضور سے تمہارے لئے بھی اجازت مانگوں!"

مشرکہ "- اگر آپ کا حکم ہو تو مجھے چلنے میں کیا عذر ہو سکتا ہے؟ میں کنیز ہوں لیکن چادر اور منت سے علیحدہ رہوں گی۔"

اسلام "کیوں؟ تم مسلمان نہیں ہو؟ خدا اور اس کے رسول سے، بزرگانِ دین سے اولیاء اللہ سے پھری ہوئی ہو؟"

مشرکہ "میں کہتی اور سمجھتی بھی ہوں کہ مسلمان ہوں مگر درحقیقت میرے عمل یہاں کے مسلمانوں کے سے نہیں ہیں۔ خدا کو وحدہٗ لاشریک، رسول کو پیغمبر آخر الزماں، بزرگانِ دین کو عمارتِ اسلام کا ستون، اولیاء اللہ کو خدا کا پیارا، غرض سب کو اپنے سے بہتر سمجھتی ہوں مگر ساتھ ہی یہ بھی سمجھتی ہوں کہ خدا ان سب سے بہتر ہے۔"

اسلام "- جو خدا کے پیارے ہیں وہ ہمارے سرتاج، ہمارے آقا ہمارے مالک ہیں اور ہمارا دین اور دنیا ان کے ہاتھ میں ہے۔"

مشرکہ "- بیشک خدا کے پیارے ہمارے سرتاج مگر دنیا اور آخرت کا اختیار تو خدا کے سوا کسی کو بھی نہیں۔"

اسلام "- کیوں؟ ان کی سفارش خالی نہیں جا سکتی۔ وہ جو کچھ چاہیں وہ کر سکتے ہیں۔ تم شاید وہابی ہو کہ حضور سے آج تک اکھڑی رہیں۔"

مشتر کہ "سفارش کی ضرورت تو اُس وقت ہو جب ہم خود وہاں تک نہ پہنچ سکیں وہاں پہنچکر ہم اور وہ دو نو برابر ہیں' وہابی ہوں نہ بدعتی خدا کو وحدہٗ لاشریک سمجھتی ہوں۔ حضور بہت کچھ تعظیم کے قابل ہیں مگر مجھے تو اُن سے زیادہ تمہاری خدمت فرض ہے"۔

اسلام "توبہ توبہ نعوذ باللہ۔ کجا حضور کجا ہیں الاحول ولا قوۃ ایسا کفر کا کلمہ؟ بس زبان بند کرو۔ یا در کھو کل دودھ چھٹ جائے گا"

بچہ کی عمر ابھی دودھ چھٹنے کی نہ تھی مگر حکم حاکم مرگ مفاجات' ساری رات اسی ادھیڑ بن میں گزری کبھی خیال کرتی تھی کہ اللہ اللہ دودھ چھٹنے کی شادی اس دھوم دھام سے اور میرے آبا و اجداد کو خبر تک نہیں۔ کبھی سوچتی تھی کیا تیری قدرت ہے، کافر اور مشرک تو ہیں ہوں، سزا کے قابل ہیں تھی' بچہ بے گناہ کس قصور میں دودھ سے محروم ہوتا ہے۔ صبح ہوتے ہی شادی کے سامان شروع ہو گئے' نوبت رکھی گئی' گانے شروع ہوئے باجے بجنے لگے اور ظہر کے بعد بچہ کو لے' ماکو چھوڑ سارا خاندان جا کر چادر چڑھا آیا۔ رات بھر جشن رہے' رتجگا رہا' ہر شخص باغ باغ اور سارا گھر خوشی کے مارے نہال نہال تھا۔ شرکت کی اجازت نہ تھی تو اسی بدنصیب کو جس کا قفل زنانہ دروازہ کا آج بھی نہ کھلا۔ کھلائی کا اثر قریب قریب تمام ماماؤں پر ہو چکا تھا ہر نوکر کو مشترکہ سے ہمدردی تھی مگر سب مجبور تھے۔ مدد سے قابل نہ تسکین کے لائق۔ یہ پہلا روز تھا کہ دودھ چھٹا۔ ساری رات آنکھیں دروازے کو لگی رہیں کہ شاید کوئی اللہ کا بندہ رحم کھا کر بچہ کی صورت دکھا دے' مگر مسلمانوں سے مرید کا کا فرما سے واسطہ کیا' پوری رات اسی انتظار میں صبح ہو گئی۔ اور یہ وہ وقت تھا کہ کامیابی کی خوشی پیر جی کے چہرہ پر زور شور سے برس رہی تھی۔

بچہ' ادھر تو چھٹا دودھ اُدھر چھٹی ما' رات تو جوں توں کاٹ دی مگر صبح سے جو بلکنا شروع کیا تو دیا اور کھلائی، دادی اور پھوپی سب ہی نے بہلایا مگر کسی طرح چپ نہ ہوا۔ بچہ کا چیخنا مشترکہ کھڑی سن رہی تھی۔ مگر پیر جی چونکہ یہ فرما گئے تھے کہ "اب ما سے بچاؤ نہیں تو وہ اس کا بھی ناس کرے گی" اس لئے کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ یہاں لے آئے جب کسی طرح

قبضہ میں نہ آیا تو خود اسد کلام لے کر بیوی کے پاس آیا۔ آنکھ میں آنسو اور زبان پر شکریہ۔ انگنائی میں ٹہل رہی تھی۔ میاں کو دیکھ کر دوپٹہ سے آنسو پونچھ لئے۔ بچہ ماں کی گود میں آکر چپکا ہوا اس کا منہ تکنے لگا۔ اس کی خاموش نگاہ ماں کی ہمدرد تھی اور دونوں ماں بیٹے ایک دوسرے کی صورت غور سے دیکھ رہے تھے۔ مشرکہ ہر چند ضبط کر رہی تھی مگر جب وہ ہاتھ اٹھا کر مسکرایا تو بے اختیار ہو گئی۔ آنسو جاری ہوئے کلیجہ سے لگا لیا اور شوہر کی طرف دیکھ کر خاموش ہو گئی۔ اس منظر کا اثر اسلام کے دل پر ہوا یا نہوا مگر پیر جی کو خبر لگی تو وہ بچہ کو ساتھ لے اپنے گھر چل دیئے اور صبح آکر کہہ دیا "بچہ کی پرورش ہمارے ہاں ہوگی"۔ کون دم مار سکتا تھا سب خاموش ہو گئے۔

ستائیسواں باب

مشرکہ کے گھر سے نکلتے ہی انعام کے ہاں پھر وہی خاک اڑنے لگی۔ آمدنی بدستور تھی مگر خرچ ویسے ہی بے ڈھنگے۔ قرضہ سال ڈیڑھ سال میں کہیں سے کہیں پہنچ گیا، برتن بکے، زیور گروی ہوا مشرکہ کی بدولت جس گھر میں دری اور چاندنی بچھ گئی تھی وہاں کتے لوٹنے لگے۔ انعام دھان پان تو پہلے ہی رہ گیا تھا، بیٹی کی مصیبت اور گھر کی تباہی نے اندر ہی اندر کھلانا شروع کیا۔ بارہا جی چاہا کہ جاؤں اور بیٹی کی صورت دیکھ آؤں مگر پیر اور نامنجار داماد کی بے رخی یاد آجاتی، اور خودداری گوارا نہ کرتی کہ گھنٹوں کھڑا رہوں اور کوئی رخ تک نہ کرے کلیجہ مسوس کر رہ جاتا۔ کئی دفعہ ارادہ کیا اور ایک دو دفعہ کہلا بھیجا کہ چند روز کے واسطے لڑکی کو بھیج دو مگر جب کوئی نتیجہ نہ نکلا تو خاموش ہو گیا۔ یہ صدمہ ایسا بیٹھا کہ بخار شروع ہوا۔ دو چار روز تو معمولی سمجھ کر ٹالتا رہا۔ مگر جب بخار نے جنبش نہ کی تو ڈولی میں پڑ حکیم کے ہاں گیا۔ علاج کے واسطے روپیہ اور تیمار دونوں کی ضرورت ہے۔ یہاں زر بل نہ باہُبل۔ دو ایک نسخہ پی بیٹھ گیا۔ مہینہ بھر کے قریب اسی طرح گذرا کہ کبھی دن کو کبھی رات کو دو چار گھنٹے کے واسطے بخار ہلکا ہو جاتا۔ ورنہ ہر وقت لوتھ پڑا رہتا۔ غذا تھی نہ دوا، کوئی اتنا تک نہ تھا کہ بہیہ کا شربت بازار سے لا دے۔ کمزوری روز بروز بڑھ رہی تھی جب چلنے پھرنے کے قابل بھی

نہ رہا تو لیٹے لیٹے بیٹی کو یہ خط لکھا:۔

"پیاری بچی ناصرہ! میں تم سے دُور ضرور ہوں مگر تمہاری تکلیفیں اور مصیبتیں ہر وقت میری آنکھ کے سامنے ہیں دل تمہاری باتوں کو اور آنکھیں تمہاری صورت کو ترپ رہی ہیں مگر زمانہ کی رفتار اور دنیا کا دستور یہی ہے کہ وہ بچی جو گھر کا اُجالا اور آنکھ کا تارا ہو دوسروں کی ایسی ملکیت ہو جائے کہ اُس کی شکل تک دیکھنی نصیب نہ ہو کلیجہ کھولنے اور دل دکھانے کی چیز نہیں جو دکھاؤں کہ تمہاری جُدائی سے مجھ پر کیا گزری اور تمہاری حالت نے میرے ساتھ کیا کیا۔ میاں اسلام کی نفرت اور پیرجی کی کرامت سب میرے دل پر لکھی ہوئی ہیں! مگر کیا کروں بے بس ہوں اور مجبور لاچار ہوں اور معذور ہوں اس صدمہ نے میری جان پر بنا دی۔ اب میں صرف اس لئے زندہ ہوں کہ لوٹ لوٹ کر مروں اور ترس ترس کر چلا جاؤں۔ دو چار دن کا اور مہمان ہوں، تم جس استقامت سے اس وقت تک توحید پر قایم شرک سے محفوظ رہیں جس فرمانبرداری سے آج تک شوہر کو سرتاج اور ساس سُسروں کو بزرگ سمجھا۔ اس کا صلہ ضرور تم کو ملے گا، مالکِ حقیقی، جس کی وحدانیت پر تم نے اپنی زندگی کی قربانی چڑھائی تمہارے صبر کو دیکھ رہا ہے میں جانتا ہوں بچہ کے فراق نے تم کو دیوانہ بنا دیا ہوگا، ضرورت ہے کہ آخر وقت تک توحید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ یہ تمام وسواس شیطانی اور رفانی مرحلے ہیں۔ سلانے والا چھیننے والوں سے طاقتور ہے اس کو بگڑ وہ وہ بچھڑ ملوا دے گا وہ وہی ہے جس نے موسیٰؑ کو دریا میں پھنکوا کر جیتا جاگتا ماں کے کلیجے سے چمٹوا دیا۔ اس کی حکومت اٹل، اس کا سکہ جاری اس کی خدائی سچی اور اس کا رحم وسیع۔ یہ آزمایش کا وقت ہے ناصرہ! ظلم کی فریاد، ستم کا شکوہ، بے اعتنائی کی شکایت، عداوت کا گلہ زبان تک نہ آئے۔ بچہ آنکھوں کے سامنے قتل ہو جائے، مگر شکر میں کمی نہ ہو، کلیجے پر چھریاں چل جائیں مگر عقیدہ توحید اپنی جگہ سے نہ سرکے ایوبؑ کی مصیبت پیش نظر رہے اور اس خدا کا بھروسہ، جس نے مدتوں کے بچھڑے یوسفؑ کو یعقوبؑ سے ملوایا۔ یہ جو کچھ ہوا کسی جرم کی سزا کسی غلطی کا بدلا کسی قصور کا معاوضہ اور نافرمانی کا نتیجہ ہے۔ اپنی حالت پر رو اپنے قصوروں پر گڑگڑا، ندامت کے

آنسو اور عبودیت کا پسینہ بیڑا پار کر دیں گے! ابراہیمؑ اس دربار سے نامراد نہ گئے، حبیبہؐ اس کی رحمت سے رابعہ اس کی قدرت سے منزل مقصود کو پہنچیں۔ شوہر کی اطاعت بزرگوں کی عظمت مسلمان کا شیوہ اور بیوی کا فرض ہے۔ یہ جوہر آبدار ماند نہ ہو۔ باپ جس کے ہاتھوں میں گوشت کا لوتھڑا انسان اور جس کی آنکھوں میں ننھی سی جان جوان بنی، کوئی دم کی ہوا کھا رہا ہے اور اس ارمان میں دنیا سے اٹھتا ہے کہ ایک دفعہ صورت دیکھ لیتا مگر انسان عاجز بندہ مجبور اور رضا کی مرضی مقدم ہے۔ صبر کرنا اور خوش رہنا، یہ سلسلے حباب اور فلق سراب تھے۔ اصلی رشتہ اسی وحدہٗ لاشریک کا ہے جس کے گیت زمین کا ہر ذرہ، جنگل کا ہر پتہ، درخت کی ہر شاخ، اور آسمان کا ہر تارہ شب و روز گا رہا ہے۔ دیو ہیکل پہاڑ، پہاڑوں کی چوٹیاں، چوٹیوں کے پرند، پرندوں کا نغمہ، نغموں کی گونج، اس کی توحید کا ثبوت، دریائے ذخار، دریا کی لہریں، لہروں کی ہستی، ہستی کا آغاز، اور انجام اُس کی قدرت کا نشان ہے۔ وہ تم سے دور نہیں تمہارے پاس ہے تمہاری حمایت کو موجود تمہاری آواز پہنچا رہی ہے نہ پہنچا مگر میری بات موجود ہوگی۔ توحید کا پختہ یقین تیری آنکھیں روشن اور تیری مامتا ٹھنڈی کر دے گا۔"

انعام کی حالت ردی تو کبھی کی ہو گئی تھی اور اس حالت کا ہر پہلو اس کو موت کا یقین دلا رہا تھا تنفس جس کا وہ ہمیشہ مریض رہا شروع ہو گیا، بہ مشکل تمام بیوی اٹھا کر بٹھا دیتی تو گاؤ تکیہ کے سہارے سے گھڑی آدھ گھڑی کو بیٹھ جاتا۔ اب اس کو سب سے زیادہ عاقبت کا تصور تھا، پچھلی زندگی پر نظر ڈالتا تو اعمال و افعال سب کلنک کا ٹیکہ تھے ہزاروں مرتبہ توبہ استغفار پڑھتا اور دن رات عفو رحم کا وظیفہ جپتا۔ ایک دفعہ آدھی رات کے وقت وہ اسی طرح پڑا سوچ رہا تھا کہ اُسے بیوی کی آئندہ عمر کا خیال آیا۔ اس کو جگا کر پاس بلایا اور کہا "مجھ سے زیادہ بدنصیب اور تم سے بڑھ کر بدقسمت اس دنیا میں کوئی نہ ہوگا۔ خدا مجھ جیسی موت کافر کو اور تم جیسی زندگی دشمن کو بھی نہ دے رہیں پھر خوش نصیب ہوں کہ دنیا کے جھگڑوں سے چھوٹتا ہوں، مگر کیسی ذلیل زندگی تھی، ایک دن خوشی کا اور ایک گھڑی چین کی نہ گزری۔

یہ صرف رسموں کے ہاتھوں اور شرک کی بدولت، روپیہ اور عزت روزگار اور حکومت کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ مگر کبھی برکت نہ ہوئی۔ کہتے ہیں مشرک کے گھر میں رحمت کا فرشتہ نہیں آتا، مگر میں یہ کہتا ہوں کہ مشرک کے گھر میں در و دیوار تک لعنت برساتے ہیں۔ میری دنیا ختم ہو چکی، اب مجھے عاقبت کا فکر ہے۔ اور فکر کیسا، کامل یقین حق الیقین کہ اس شرک نے دنیا تو برباد کی ہی تھی، دُنیا کے ساتھ دین بھی غارت کیا۔ میری دلی آرزو یہ تھی کہ تمھیں اپنے ہاتھ سے سپرد زمین کر دیتا، مگر میری آرزو کیوں پوری ہوتی۔ بندہ عاجز ہے میں جانتا ہوں کہ اب تمہارے واسطے در در کی بھیک اور گھر گھر کی ٹھوکریں ہوں گی۔ یہ تمہاری نافرمانی کی سزا اور میرے گناہوں کی پاداش ہے۔ میری موت پہلی موت نہیں۔ میں نے بہت سی موتیں دیکھیں، مگر یہ حالت جو مجھ پر اس وقت گذر رہی ہے خدا کسی کو نہ دکھائے۔ یہ میری آخری گھڑیاں ہیں اور میں اس وقت اس صورت کو ترس رہا ہوں جو میرے کلیجے کا ٹکڑا اور عمر بھر کا اثاثہ تھا۔"

بچی کا خیال آتے ہی انعام کی حالت بالکل خراب ہو گئی "ہائے!" کا ایک نعرہ مارا اور بچی کا نام لے کر خاموش ہو گیا۔ اب اگر اس کو کچھ خیال تھا تو مشرکہ کا۔ آنکھیں بند کئے پڑا تھا۔ ھاجرہ سرہانے بیٹھی اس شوہر کی صورت دیکھ رہی تھی جس کی بدولت عمر بھر راج کیا، اور جو اب ہمیشہ کو بچھڑنے والا تھا۔ انعام خاموش تھا، اس کی آنکھیں بدستور بند رہیں، اس نے کانپتا ہوا ہاتھ اُٹھایا ایک اُنگلی کھڑی کی اور کہا:-

"تم لوگ صاحب اولاد ہو، میں نے تم کو اس لئے بیٹی نہیں دی تھی کہ میں اس کی صورت کو ترستا دنیا سے رخصت ہو جاؤں۔ ذرا میرے دل کو دیکھو اور انصاف کرو۔ مجھ پر رحم کرو اور میری بچی کو اجازت دو کہ وہ باپ کو اس دنیا سے رخصت کر دے۔"

ھاجرہ یقین کر چکی تھی کہ آج عمر کا رفیق ہمیشہ کو جدا ہوتا ہے۔ انعام کی یہ حالت دیکھ کر اس کی حالت اور بھی خراب ہوئی اور کہنے لگی "خدا کا واسطہ ذرا تو آنکھ کھولو! بہک رہے ہو؟"

انعام کی آنکھیں اسی طرح بند تھیں۔ خاموش تھا پھر تھوڑی دیر بعد بولا:-

"آ پیاری گلے سے لگ جا۔"

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی اور ایک وہ روح جو چند لمحہ بعد دنیا کے تمام تعلقات ختم کرنے والی تھی اس قوم کی عنایت سے جس کا دعویٰ ہے کہ حقوق نسواں کی سب سے زیادہ حفاظت اسلام نے کی اپنے محبوب کی صورت کے انتظار میں صرف اس لئے کہ وہ ایک مسلمان شوہر کے نکاح میں تھی' ناشاد و نامراد رخصت ہو رہی تھی۔ دو گھنٹے سے قریب انعام کی حالت یہی رہی۔ وہ چونک پڑتا تھا، چیختا تھا، پکارتا تھا اور بچی کو آوازیں دیتا تھا۔ رات کے آخری حصہ میں اس کی حالت بالکل ہی ابتر ہوگئی۔ دفعتہً اس نے ایک چیخ ماری! "مشترکہ! مشترکہ!" کہہ کر آوازیں دیں' ایک ہچکی آئی اور ختم ہوگیا۔

اٹھائیسواں باب

قیاس چاہتا تھا کہ شوہر کے مظالم کا پھوڑا ہیر جی کے نمک سے پھوٹ جاتا اور مشترکہ دامنِ استقلال ہاتھ سے کھو بیٹھتی' مگر توحید کے پکے عقیدے اور خدا کے پورے بھروسہ نے اس کو سنبھالا' مگر ماں تھی بچہ کا فراق ایسا نہ تھا کہ آسانی سے برداشت کر جاتی۔ رات رات بھر انگنائی میں ٹہلتی' وہ چہرہ جو شادی سے پہلے گلاب کی طرح تروتازہ تھا مرجھا گیا' آنکھیں گڑ گئیں اور ایک ڈھانچ رہ گیا۔ سر کا ہوش تھا نہ منہ کا۔ پندرہ پندرہ روز گزر جاتے کس کا سر اور کیسا لباس۔ دیوانوں کی طرح گھر بھر میں پھرتی۔ تھک کر پڑ جاتی مامتا جوش کرتی طبیعت گھبراتی' دل پریشان ہوتا' چھاتی امنڈتی' اٹھ کھڑی ہوتی' آسمان کو دیکھتی' زمین پر نظر ڈالتی' بچہ کا نام لیتی' چیختی آوازیں دیتی' تاروں سے خطاب کرتی چاند سے باتیں کرتی' تین تین دن چار چار دن کھانا پڑا جھک مارتا' اور وہ آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتی۔ جب یہ خیال آتا کہ میری دشمنی کا بدلہ اس پھول سے لیا جاتا ہوگا' پٹتا' گھٹتا ہوگا' تو اتنا کہہ کر چپ ہو جاتی۔

"شکر ہے تیرا' میرے مولا! شکر ہے۔"

اس کا ایک میلا کپڑا اوڑھ، پھر منہ پر رکھتی۔ اس کی خوشبو سونگھتی، چومتی، آنکھوں سے لگاتی، سر پر رکھتی، کلیجہ سے لگاتی۔ اسی حالت میں باپ کا خط ملا، پڑھا، کانپ گئی، تھرا اٹھی۔ دوبارہ پڑھا خط ہاتھ میں تھا، ہوش حواس رخصت ہو چکے تھے، جو دل بچہ کے زخم سے گھائل ہو چکا تھا، اُس پر باپ کا یہ خط، وہ چرکا تھا، جس نے عقل زائل کر دی اسی حالت میں اسلام جو کبھی بھولے بھٹکے آنکلتا تھا۔ سامنے آ گیا۔ اس کی صورت غور سے دیکھی کچھ دیر خاموش رہی، اس کو خط دیا، اُس کے قدموں پر گری، اور کہا "میرے بچہ کی صورت ایک دفعہ دکھا دو اور اجازت دو کہ میں باپ کا چہرہ دیکھ لوں۔"

شوہر "تمہارے والد کو مرے ہوئے آج تیسرا روز ہے۔ اب جا کر کیا کرو گی؟ بچہ وہاں بہت آرام سے ہے عید پر آئے گا دیکھ لینا۔"

باپ کی خبر موت سُن کر ایک چکر آیا، گرتی تھی سنبھلی اور بآوازِ بلند کہا: "الٰہی میرے باپ کو بخشد یجیو۔" اسلام چلا گیا تو خط پھر پڑھا آنکھوں سے لگایا۔ وضو کیا۔ نماز پڑھی فاتحہ پڑھی اور سجدے میں گر کر باپ کی مغفرت کی دعا کرتی رہی۔

انتیسواں باب

نواب صاحب ہجرت کے متمنی عرصہ سے تھے، مگر دنیا کے بکھیڑے فرصت نہ دیتے تھے۔ اس سال اُنھوں نے مصمم ارادہ کیا، اور خدا کی عنایت سے وہ ارادہ پورا بھی ہوا بیگم صاحب کا خیال جانے کا نہ تھا، مگر شوہر کے بعد اُنھوں نے بھی رہنا مناسب نہ سمجھا اور دونوں میاں بیوی تمام معاملات اسلام کے سپرد کر، بیت اللہ روانہ ہو گئے۔

ماباپ کے بعد سیاہ و سفید کا مالک اسلام تھا مشیر صلاح کار گنو یا سمجھو، باپ کہو، پیر کہو، جو کچھ تھے وہ پیر جی۔ اُن کی بلا اجازت پتہ توڑنا، اور بے حکم سانس نہ لیتا کئی سال اسی طرح بسر ہوئے، بچہ بارھویں برس میں تھا، باپ کے پاس آنا جانا تھا ماں کا کمرہ بھی دور سے دیکھتا تھا۔ مگر یہ نہ جانتا تھا کہ بدنصیب ماں یہیں ہے۔ باپ کو باپ سمجھتا تھا اور

چونکہ یہ کہدیا گیا تھا کہ "ماں مر گئی" اس لیئے پیرانی جی کو جنھوں نے پرورش کی ماں سمجھنا تھا، کثرتِ غم اور وفورِ الم نے اب مشترکہ کی صرف ہڈیاں ہی ہڈیاں چھوڑی تھیں۔ شوہر ہاتھ سے گیا، عمر برباد ہوئی، بچہ چھوٹ گیا، یہ ایسے صدمے نہ تھے کہ مشترکہ زندہ رہتی مگر نہ معلوم موت کہاں رہ گئی تھی جس نے اُس کی حالتِ زار پر کبھی رحم نہ کیا۔ دیوانی تو نہ تھی، مگر باتیں دیوانوں کی سی کرنے لگی تھی۔ اسلام کے راج میں اتنی آزادی مل گئی تھی کہ آٹھ سال بعد وہ قفل کھل گیا۔ اور دالان کی آمد و رفت شروع ہو گئی تھی۔ دفعہ ایسا ہوا ہے کہ لیٹے لیٹے گھبرا کر اٹھی، دروازہ تک آئی اور ارادہ کیا باہر نکل جاؤں، ایک دفعہ بچہ کو کلیجے سے لگا لوں مگر پھر خیال آتا کہ بڑوں کی لاج اور باپ دادا کی آبرو پہ پانی پھر جائے گا۔

بچہ کا ہوشیار ہونا تھا کہ پیرجی کو اور سہم چڑھا، لیکن پھر غنیمت تھا کہ سب داؤں پورے اور ہر تدبیر کامیاب ہوئی۔ انجان، جو سمجھا دیا وہ سچ سمجھا جو کہہ دیا وہ مان لیا، مگر اب پردہ کا بدستور رہنا مشکل تھا اور پیر صاحب کو پورا کھٹکا تھا کہ رنگ لائے گی۔ ہاتھی پھرے گاؤں گاؤں جس کا ہاتھی اس کا ناؤں (نام) یہ سانپ کا سپنولیا، اژدھے کا افعی اور بھیڑیئے کا بچہ ہے کوئی ایسی صورت ہو کہ اگر عمر بھر نہیں تو کم سے کم میری عمر تک دونوں ماں بیٹے آپس میں ملنا کیسا ایک دوسرے کی صورت تک نہ دیکھیں۔ بہت سوچ اور فکر کے بعد یہ ترکیب سمجھ میں آئی کہ مشترکہ کو اس گھر سے ہی غارت کروں۔ نواب صاحب اور بیگم صاحب معتقد ضرور تھے اور ضرورت سے بہت زیادہ پیرجی اور پیرانی جی کی نظر کرتے مگر ان کا جانا تھا کہ مکار نے اسلام پر وہ بُری ڈالی کہ جس قدر آمدنی تھی اس کا بڑا حصہ نیر ہونے لگا۔ قرضہ شروع ہوا جائداد رہن ہوئی، اور ایک تین ہی چار سال کے الٹ پھیر میں اسلام سر سے پاؤں تک قرض میں ڈوب گیا۔ ہر چند سوچتا اور بار بار غور کرتا مگر کوئی بات سمجھ میں نہ آتی۔ اسی معاملہ پر وہ ایک روز پیرجی کے سامنے اظہارِ پریشانی کر رہا تھا، بچہ بھی موجود تھا کہ پیرجی نے کہا "ایک مشترک نافرمان کی وجہ سے ساری مخلوق پر آفت آتی ہے تم اس مشترکہ

کو یہاں سے علیحدہ کردو جب ماباپ نے یہ نام تجویز کیا تو پھر اس کے منحوس ہونے میں کس کو کلام ہوسکتا ہے؟ میں تو نکاح ہی کے وقت اس نام سے بھڑکی تھا۔ مگر بیگم صاحب کے اصرار سے خاموش ہوگیا۔ آمدنی وہی۔ خرچ وہی۔ پھر یہ مصیبت اور قرض کیسا؟ صرف اسی کم بخت مشرکہ کے اعمال کی سزا سب بھگت رہے ہیں۔"

بچہ:۔ "جب حضور فرما رہے ہیں تو آپ علیحدہ ان کا انتظام کردیجئے وہ اور کہیں رہیں۔"

تعمیل میں دیر کیا اور جانے میں تاخیر کیوں، خوش قسمتی سے ھاجرہ ابتک زندہ تھی اور گو وہ زندہ مردوں سے بدتر تھی، پیٹ کو ٹکڑا انہ تن کو چیتھڑا، مگر اس کے سوا ٹھکانا ہی کون سا تھا، چلی آئی، ماکو دیکھے پانچ برس ہوگئے تھے کیا خدا کی شان تھی جوان سے ادھیڑ ہوگئی۔ سیاہ بال سپید ہونے شروع ہوگئے۔ روتی ہوئی اتری تو ماخود ہی مردوں سے بدتر پڑی تھی۔ سامنے آکر قدموں میں گری، تو، ھاجرہ جس کی آنکھیں اب برائے نام رہی تھیں بچی کو پہچان نہ سکی۔ ڈر گئی، پوچھا "کون ہے" جب مشرکہ نے کہا "میں ایک نامراد لونڈی" تو مدت کی بچھڑی ہوئی بچی کی آواز سنتے ہی آنکھ سے آنسو نکل پڑے، اس کا سر اٹھا گلے سے لگایا، اس کی بلائیں لیں اور کلیجے میں گھونسے مارنے لگی۔

مشرکہ کی زندگی کا یہ وہ حصہ ہے جس کو دیکھ کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں اسلام اس کا کھانا دونوں وقت بھیجتا تھا، مگر وہ آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتی تھی۔ اس کو یقین کامل تھا کہ میری جنت میری مغفرت میرے خدا کی رضامندی ما کے قدموں میں ہے ہر وقت اس کی خدمت میں لگی رہتی، بچہ کا خیال دم بھر کو اس کے دل سے اور اس کی تصویر لمحہ بھر کے لئے اس کی آنکھ سے اوجھل نہ ہوتی۔ روتے روتے ایک آنکھ میں پانی اتر آیا، نوبت یہاں تک پہنچی کہ کھڑی ہوتی تو چکر اور بیٹھتی تو غش آتا۔ عالمِ خیال میں بچہ کا نام لیکر پکارتی۔ کئی مہینہ تک یہ حالت طاری اور سلسلہ جاری رہا۔ آدھی رات کے وقت پاؤں دباتی دباتی اٹھی، وضو کیا سجدہ کیا، روئی اور کہنے لگی :۔

"جلی ہوئی ٹہنیاں تیرے ادنیٰ اشارے سے لہلہا گئیں۔ اُجڑے ہوئے گلشن تیرے ایک حکم سے سرسبز ہو گئے۔ تو نے مدتوں کے بچھڑے دم بھر میں ملا دئے اور نا اُمیدوں کو آناً فاناً مالامال کر دیا۔ میری آنکھیں ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے اندھی اور میرا دل روتے روتے دیوانہ ہو گیا۔ ایک دفعہ بچے کو کلیجہ سے لگا لوں اور تیرا شکر کرتی ہوئی تیرا کلمہ پڑھتی ہوئی اس حالت میں کہ بچھڑا ہوا بچہ کلیجے سے چمٹا ہو دنیا سے اُٹھ جاؤں۔"

تیسواں باب

ماباپ کی ہجرت اسلام پر مصیبت کا آغاز تھا۔ قرض دن بدن بڑھتا جا رہا تھا مرے پر سو دُرّے، دوسری آفت آئی کہ برسات پوری گزر گئی اور ایک قطرہ مینہ کا نہ برسا۔ جن کھیتوں میں ہزاروں من غلّہ پیدا ہوتا تھا وہاں خاک اڑنے لگی۔ ندی نالے خشک ہو گئے۔ کنوؤں کا پانی ختم ہو گیا۔ کاشتکاروں کے نالے اسمان تک پہنچے، قحط نواب صاحب کے زمانہ میں بھی پڑے اور ایسے ایسے کہ من بھر کا گیہوں پان سیر کا بک گیا۔ مگر یہ مصیبت نہ آئی تھی کہ گیہوں کا دانہ اشرفی کو۔ ساری کاشت میں مینہ نہ تھا، کاشتکار اپنی گرہ سے تو ادا کرنے کو رہے، وہی کنواں کھودنا اور وہی پانی پینا۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے۔ زمیندار کا روپیہ تو خاک دیتے، جانوں ہی کے لالے پڑ گئے، میاں اسلام کے پلّے کیا تھا جو سرکاری مالگذاری ادا کرتے، جن ساہوکاروں سے لین دین تھا اُن کی اصل تو کیا سود تک کبھی نکلنا نصیب نہ ہوا۔ اُن سے مانگنے کا مُنہ نہ تھا۔ پیرجی کے پاس سب کچھ تھا، جائداد بھی املاک بھی، زیور بھی، نقد روپیہ بھی اور اشرفیاں بھی۔ مگر اس بھلے مانس کو غرض کیا پڑی تھی کہ کام آتا۔ جو ہوا وہ دیکھا، جو گذری وہ سہی، اس موقعہ پر البتہ اسلام کے چھکّے چھوٹ گئے پیرجی سے کہا کہ "حضور روپیہ کا انتظام کیا کروں تاریخ قریب آ گئی دو ہزار روپیہ دینا ہے۔"

شاہ صاحب: "خدا پر بھروسہ کرو وہی مدد دے گا۔"

شاہ صاحب تو یہ کہہ کر ستے چھوٹے مگر اسلام کے کلیجے کو لگ رہی تھی چاروں

طرف نظر ڈالتا مگر کوئی گھر ایسا دکھائی دیتا نہ کوئی رشتہ دار کہ اس وقت کام آجائے رات کی نیند تھی نہ دن کی بھوک ہر وقت اسی خلجان میں پریشان تھا سوچتے سوچتے اُسے خیال آیا کہ مشرکہ کو جو زیور ہمارے ہاں سے چڑھا تھا وہ نہ معلوم اماں جان نے لے لیا یا اس کے پاس ہے۔ رات کے دس بجے ہوں گے کہ چپکا اٹھا اور سیدھا پہنچا۔ جھانک کر دیکھتا ہے تو بیوی جانماز پر بیٹھی عشاء کی نماز پڑھ رہی ہے۔ ٹہلنے لگا مشرکہ سلام پھیر چکی تو کہنے لگا۔

"مجھے دو ہزار روپیہ کی سخت ضرورت ہے اگر ہمارا زیور تمہارے پاس موجود ہو تو دے دو۔

مشرکہ "چڑھاوے کا تو ہجرت کے وقت اماں جان نے واپس لے لیا تھا، تم ہی لے گئے تمہیں یاد نہ رہا ہوگا۔ ہاں جو یہاں سے ملا تھا وہ جوں کا توں موجود ہے مگر یہ چھ سات سو کا ہے۔ پھوپا ابا جنھوں نے مجھکو یہ مکان دیا تھا اُن کے لڑکے یہ مکان مول لینا چاہتے ہیں تین ہزار روپیہ دے رہے ہیں وہ لے لو۔"

اسلام "اچھا تم صبح ہی ان سے گفتگو کر لو۔"

مشرکہ "میں اُن سے تمہارے پیچھے گفتگو کرنی نہیں چاہتی۔ سامنے مکان ہے بلا لو ابھی طے کر لو۔"

اسلام روپیہ پر ادھار کھائے بیٹھا تھا اور ضرورت تھی بھی ایسی ہی۔ اُسی وقت بات چیت ہوئی اور صبح مکان اُن کو دے کر روپیہ لے لیا۔

بچہ نے جب یہ سُنا کہ ابا جان کی منکوحہ جو یہاں رہتی تھی اس نے اس وقت اتنا بڑا کام کیا، حالانکہ ہم نے اس کو نکال دیا، تو زیادہ تر اس لئے کہ وہ پیرجی کی اندرونی حالت سے اچھی طرح واقف تھا اور خوب جانتا تھا کہ دو ہزار کیا وہ چاہیں تو دس ہزار دم بھر میں دیدیں، عورت کی خدمت کا قائل ہوگیا۔ اس میں شک نہیں کہ صحبت نا اہلوں کی تھی مگر دودھ اُس ماں کا تھا جس نے توحید پر دنیا قربان کر دی۔ اسلام نے پیرجی کی بیوفائی پر مطلق خیال نہ کیا، مگر بچہ لاکھ بچہ تھا فوراً کھٹک گیا۔ بظاہر اُس نے آداب و تعظیم میں فرق نہ آنے دیا۔

مگر وہاں کا رہنا سہنا موقوف کر باپ کے پاس نہ صرف رہنے لگا بلکہ تمام کام کی دیکھ بھال شروع کر دی۔ باپ بیٹے کی اس توجہ سے بہت خوش ہوا مگر پیر جی کی طرف سے بے اعتنائی اس کو نہ بھائی۔ مگر یہ بیوی تھوڑی تھی کہ نکال باہر کرتا۔ پیر جی کا بس چلتا تو وہ زہر بھی دیتے۔ اور اگر ان کو یقین ہو جاتا کہ بڑا ہو کر ایسا فرنٹ ہو گا تو بچپن میں گلا گھونٹ دیتے۔ اب پچھتاتے تھے اور دیکھ دیکھ کر انگاروں پر لوٹتے تھے۔ اس کے سوا چارہ نہ تھا اور یہی کیا اور کرنا پڑا کہ وہی پیر جی جو گھر بھر کو ناک چنے چبواتے تھے بچّہ کے سر پر ہمیشہ ہاتھ پھیرتے اور دعائیں دیتے اب پیر جی کی تمام کوششیں محض اس خبط میں صرف ہو رہی تھیں کہ کسی طرح اس کو ما کا حال معلوم نہ ہو یا دو نوں میں سے ایک مر جائے۔ مامائیں مشرکہ کے ہاں جاتی رہتی تھیں اس کی حالت دیکھ کر کڑہتی تھیں، اس کی مصیبت سن کر روتی تھیں، تسلّی دیتی تھیں، تشفی کر کرتی تھیں مگر اتنی ہمت کسی کی نہ تھی کہ بچّہ سے یہ راز کہہ سکے۔ مشرکہ کی یہ حالت مُردوں سے بدتر تو پہلے ہی تھی اب رہی سہی طاقت بالکل ہی زائل ہو گئی۔ مامتا زیادہ بھڑکی دل بہت تڑپا تو ایک روز ماما سے کہا "مجھے لے چل اور اتنا رحم کر کہ دُور سے وہ صورت دکھا دے"۔ ماما بچّوں والی تھی مشرکہ کی منّت سماجت پر رو پڑی اور کہا "بیوی خدا تیری مامتا ٹھنڈی رکھے تیرا بچہ پروان چڑھے چل میرے ساتھ چل"۔ تیار ہو ئی برقع اوڑھا، آگے آگے ماما پیچھے پیچھے آپ دروازہ کا پردہ اٹھا رہی تھی کہ دل نے صدا دی کہ مشرکہ، شوہر کی بلا اجازت برقع ڈال کر، ماما کے ساتھ گھر سے باہر جانا شرافت سے بعید ہے۔ سہم گئی اور یہ کہہ کر گھر میں لوٹ آئی "نہیں۔ بی جب خدا ملائے گا جب ہی مل لونگی"۔

اکتیسواں باب

مشرکہ لوٹنے کو اس روز لوٹ آئی مگر کیفیت یہ تھی کہ کھانا اور پینا، چلنا اور پھرنا۔ سب دوبھر ہو گیا۔ آسمان پر ابر چھایا ہوا تھا اور بوندیاں پڑ رہی تھیں، اولے گر رہے تھے اور بچّہ کی تصویر ذہن میں رکھے چکور کی طرح اس چاند پر نثار ہو رہی تھی۔ بارش کا خیال تھا نہ

اولوں کی پروا بجلی کا ڈر نہ تھا نہ بادل کا خوف، رات سکرات زیست میں گزر گئی۔ صبح صادق کا وقت قریب تھا۔ مرغ اذان دے رہا تھا کہ دروازے پر کسی نے دستک دی۔ محبت کی دیوانی ہر خوف سے آزاد اور ہر ڈر سے بے فکر بھاگی گئی دروازہ کھولا اور پوچھا "کون ہے" ایک عورت روتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ یہ بچہ کی کھلائی تھی۔ ایک چیخ ماری اور کہا "بدنصیب ماں چل اور بچہ کی صورت دیکھ لے۔ میاں نے بلایا ہے۔ بہلی موجود ہے۔ رات کو کسی دشمن نے زہر دیدیا۔ اب حالت زیادہ خراب ہے اور چلنے کا پھیرا! بس بیوی اللہ ہی اللہ ہے۔"

مشرکہ انا کا پیغام سن کر ہنسی اور کہا "بوا کیا کہتی ہے کیا یہ وقت بھی دیکھوں گی!!" منہ آسمان کی طرف کیا اور کہا "کیوں میاں یہ تماشا بھی دکھاؤ گے!! تیری رحمت وسیع ہے، میری التجائیں اکارت گئیں! اے اللہ مجھ پر رحم کر، میری عمر بھر کی ریاضت ہے! مولا بدنصیب ہوں میرے اعمال پر نظر نہ ڈال، میری درخواست کو دیکھ۔ اے اللہ رحم کر، میرے آقا رحم کر۔"

اب دل بھر آیا تھا آنسو نکل پڑے تھے کہ مؤذن نے صبح کے سنسان وقت میں نعرۂ توحید بلند کیا کھڑی ہوگئی اور کہا "حق نام تیرا" وضو کیا، نماز پڑھی، سلام پھیرا، روئی، گڑگڑائی کہا جو کچھ کہنا تھا اور مانگا جو مانگ سکتی تھی۔ اٹھی بہلی میں بیٹھی، اور بچہ کے پاس پہنچی جس بچہ کو ایک ظالم پیر نے سیاہ بالوں والی ماں سے ہمیشہ کو جدا کر دیا تھا آج قدرت سفید بالوں میں وہ بچھڑا ہوا لال کلیجے سے چمٹواتی ہے۔ بہلی میں بیٹھی تو سوچنے لگی زندہ دیکھتی ہوں یا مردہ! انا کہتی ہے حالت خراب ہے۔ کوئی دم کا مہمان ہے۔ اسلام میری گود سے بھلا چنگا لے کر گیا تھا۔ وہ ذمہ دار ہے کہ میرا بچہ جیتا جاگتا مجھ سے ملا دے، مگر نہیں کیسا اسلام کہاں کا شوہر، میرا شوہر تو وہ طاقت والا ہے جو آج نو سال بعد مجھکو صورت دکھاتا ہے۔ میری امانت اس کے پاس ہے زندہ لوں گی لیکن میری تقدیر اس لائق نہیں۔ مر چکا ہوگا۔ میری راہ کس نے دیکھی ہوگی۔ نہلا رہے ہوں گے۔ لے گئے ہوں گے، قبرستان جاؤں، صورت دیکھ لوں گی" ان ہی خیالات میں غلطاں پیچاں پہنچی، اتری، اسلام کھڑا تھا سامنے لیا اور کہا "مشرکہ تیرے بچہ کو کسی ظالم

نے زہر دے دیا۔ ڈاکٹر کا بیان ہے کہ دودھ میں ملا ہوا تھا، اس کو ہوش ہوتا تو بتاتا کہ دودھ کس نے دیا اب حالتِ نزع ہے اُس کو دیکھ لے اور صبر کرے۔"

مشرکہ "میرے سرتاج میرا منہ نہیں کہ آپ کا شکریہ ادا کر سکوں آپ نے اس آخری وقت میں مجھ کو میرے لال کی صورت دکھادی میں نو سال بعد وہ مکھڑا دیکھتی ہوں جس کی دیوانی تھی۔ چلئے خدا کے واسطے جلدی قدم اُٹھائیے۔"

دونوں میاں بیوی ایک کمرے میں داخل ہوئے جہاں ایک نوعمر بچہ بیہوش پڑا تھا۔ مشرکہ کی پہلی نظر پڑی وہ ٹھٹکی۔ قبلہ کی طرف منہ کیا۔ گردن جھکائی سجدہ میں گری اور کہا "تیری خدائی تجھی کو سزاوار ہے، میری التجا سن لی میری آرزو پوری کی۔ میری آنکھیں روشن اور میرا کلیجہ ٹھنڈا کیا، تنکے میں جان ڈالنے والے دکھیاری ماعمر بھر کی ترسی اور مدتوں کی بچھڑی صرف تجھ سے بلتجی ہے اس کی موت نہ دکھا الٰہ العالمین اس وقت سے پہلے ماکو اٹھالے۔"

بچہ کے قریب آئی اس کا سر اپنی گود میں لیا منہ پر منہ رکھا۔ پیار کیا۔ مامتا کی آگ آنسو بن کر آنکھ سے نکلی۔ اسلام تھوڑی دیر تک بیٹھا رہا اور پھر دوا کی شیشیاں بیوی کے سپرد کر باہر چلا گیا۔ اب وہ وقت تھا جو آنکھیں گھر کے ہر کونہ اور شہر کے ہر چپہ سے مایوس ہو چکی تھیں بچہ کو کلیجے سے لگا کر اس کی بھولی صورت پر ٹکٹکی لگائے ہوئے تھیں۔ بچہ بیہوش تھا، جھنجھوڑتی تھی، جگاتی تھی، آوازیں دیتی تھی، مگر کوئی کوشش کارگر نہ ہوتی تھی، اُٹھتی، بلائیں لیں، قربان ہوئی، ہاتھوں کو گلے میں ڈال دیا، پاؤں کو بوسہ دیا اور صورت دیکھنے لگی جب کسی طرح ہشیار نہ ہوا تو دو کھڑی ہوگئی۔ پاس آئی، اُس کا منہ دیکھا، ہاتھ پاؤں دیکھے، لپٹ گئی۔ دوا کا وقت آگیا تھا میاں کی ہدایت کے بموجب زبردستی دوا حلق میں ڈالی، اور رات بھر اسی طرح اپنی شمع پر قربان ہوتی رہی۔

دو دن اور دو رات بچہ کی حالت یہی رہی۔ تیسرے دن شام کو طبیعت ذرا ہشیار ہوئی زہر کا اثر زائل ہو گیا مگر نقاہت کا یہ عالم تھا کہ بات نہ کی جاتی تھی۔ ہر وقت آنکھیں

بند کئے خاموش پڑا رہتا۔ اسلام لاکھ پیر جی کا بندہ اور مشرکہ کا شوہر تھا مگر بچہ کی خبر سنتے ہی دنیا آنکھوں میں اندھیر ہو گئی تھی۔ اکثر آتا گھنٹوں بیٹھتا ڈاکٹر نے اطمینان دلا دیا تو چھپے یا سانپ بیں روتا ایک موقع پر بیوی سے کہنے لگا "حضور کی دُعا خالی جانے والی نہیں۔ اول تو ٹال ہی دیتے ہیں مگر جب انھوں نے دُعا کی ہم نے کبھی نہیں دیکھا کہ خالی گئی ہو۔"

مشرکہ "میں تو خدا کی عنایت سمجھتی ہوں حضور کی دُعا ضرور ہو گی لیکن بڑا احسان تو اس کا ہے جس نے ہم پہ رحم کیا۔"

اسلام "ایک حضور کی نافرمانی سے کیسی کیسی مصیبتیں تم پر آئیں یہ اُن کی عنایت وکرم ہے۔ کہ تمہارا بچہ تم سے مل گیا۔ مگر اب بھی اُن کا گُن نہیں مانتیں اور اپنا فرض ادا نہیں کرتیں"

مشرکہ۔ نافرمانی تو خدا کی ہے حضور کی کیا ہو گی۔ احسان سب سے بڑا خدا کا جس نے فضل کیا اور فرض تم سے زیادہ مجھ پر اور کس کا ہے۔"

بچہ یہ تمام باتیں چپکا پڑا سن رہا تھا آج اس کو یقین ہو گیا کہ میری ماں یہی ہے اور اس بدنصیب پر جو کچھ مظالم ٹوٹے وہ اس کمبخت پیر کی بدولت۔ رات کو جب مشرکہ کی حالت دیکھنے والا خدا یا اس بچہ کے سوا کوئی نہ ہوتا تھا اور وہ فرطِ محبت سے بیتاب ہو کر اپنے جذبات کا اظہار کرتی تھی اور یہ سمجھ کر کہ بے خبر ہے اپنی آنکھ اس کے رخسار سے ملتی، چمٹتی، پیار کرتی، بلائیں لیتی اور دُعائیں مانگتی تو بچہ بھی بے چین ہو جاتا، چاہتا تھا کہ کسی طرح خود بھی گلے میں ہاتھ ڈال کر لپٹ جائے۔ مگر ضبط کرتا اور چپکا پڑا رہتا۔

ایک موقعہ پر وہ کہہ ہی بیٹھا "آپ کون ہیں جو ہر طرح میری خدمت کر رہی ہیں؟"

مشرکہ "میں تمہارے والد کی لونڈی اور تمہاری دودھ پلانے والی ہوں۔"

بچہ "میری والدہ کو آپ نے دیکھا تھا؟"

مشرکہ "نہیں میں نے نہیں دیکھا۔"

بچہ "آپ کو مجھ سے اس قدر محبت کیوں ہے؟"

مشرکہ "اس لئے کہ میں نے دودھ پلایا ہے۔"

مریض کی حالت روز بروز رو بہ صحت تھی، تندرست ہوتے ہی غسل صحت کی شادی کا اعلان ہوا اور پیر جی کے حکم سے مشرکہ پھر اپنے گھر بھیجدی گئی۔

تیاریاں دھوم دھام سے ہوئیں ہر متنفس خوشی کے مارے نہال نہال تھا۔ اسلام کی باچھیں کھلی جاتی تھیں، ایک روز قبل باپ بیٹوں کی گفتگو اس طرح ہوئی۔

بچہ "میری ماں کہاں ہے؟"

باپ "تم کو اس سوال کی کیا ضرورت ہے؟"

بچہ "اس سے زیادہ ضروری سوال کیا ہو سکتا ہے؟"

باپ "زندہ ہیں اور اپنے گھر ہیں، وہی جو تمہاری بیماری میں یہاں آئی تھیں۔"

بچہ "وہ کس جرم میں یہاں سے نکالی گئیں؟"

باپ "مشرک ہیں، نافرمان ہیں، حضور کی دشمن، پیر پیغمبروں سے بدظن!"

بچہ "یہ کمبخت حضور جو پیر بنا ہوا ہے، جس نے مجھ کو زہر دیا اور اپنے ہاتھ سے دودھ پلایا، اللہ والا ہے؟ ابھی اس کمبخت کو یہاں سے غارت کیجئے۔"

باپ "مجھے اس کا علم نہیں۔ اس نے دودھ دیا تھا؟"

بچہ "جی ہاں اس نے اپنے ہاتھ سے دیا، چمکار کے دیا۔ پیار سے دیا۔ پہلا گھونٹ اترتے ہی مجھے ہوش نہ رہا۔"

باپ "روبیہ کے موقع پر تو میں بھی اس سے جلا ہوں۔ یہ آسانی سے انتظام کر سکتا تھا مردود کو ابھی نکال دیتا ہوں۔"

بچہ "ذرا صبر کیجئے اسے میری والدہ کی موجودگی میں نکالئے جنہوں نے اس کے ہاتھوں ایسی سخت تکلیف برداشت کی ہے جس کے خیال سے تکلیف ہوتی ہے اور میں سب سن چکا ہوں۔"

پینس بھیجدی گئی اور مشرکہ اپنی ماہاجرہ کو لئے چلی آئی میاں کے کہنے سے اس نے نہادھو کر کپڑے بدلے جب وہ صدر دالان میں قدم رکھتی تھی تو سامنے سے بچہ آکر قدموں پر گرا اور کہا "میری بدنصیب ماں میرے باپ کا قصور معاف کرئے"

اسلام نے بیوی کے سامنے گردن جھکادی اور صرف اتنا کہا "بیشک نیک کوک کی بیٹی! تیرا ایمان سچا، اور تیرا خدا وحدہٗ لاشریک، اُسی خدا کا واسطہ اور اس بچہ کا تصدق میری غلطیوں سے درگزر کرے"

مشرکہ کی آنکھ سے آنسو کی لڑیاں بہہ رہی تھیں۔ بچہ کا سر اس کی گود میں تھا۔ اسی طرح بچہ کو چمٹائے وہ شوہر سے کہنے لگی "اصلی مالک خدا ہے میں نے معاف کیا دُعا کرتی ہوں کہ وہ معاف کرئے۔ اس کے بعد تینوں کے تینوں اس مکار پیر کے پاس گئے اور لڑکے نے کہا۔ "دیکھ او جفا شعار پیر او ظالم مکار! میری ماں کا خدا اس کے ساتھ تھا جس نے میری صورت دکھا کر اُن کی آنکھیں روشن کردیں۔ کھڑا ہو جا اور اسی وقت اس گھر سے غارت ہو۔"
جب پیر جی چلنے لگے تو مشرکہ نے کہا "اس وقت جب تم پیر تھے میں خاموش تھی مگر آج جب مردود ہو اس لئے کہ بزرگ ہو اور تمہارے بال سفید ہیں میں التجا کرتی ہوں کہ میرے بچہ کے واسطے بددُعا نہ کرنا"

سنہ ۱۷ء

ختم شد

(مطبوعہ محبوب المطابع دہلی)

کاغذ کی گرانی کی وجہ سے کتابوں کی قیمت پانچ آنے فی روپیہ بڑھ گئی ہے

مصورِ غم حضرت علامہ راشد الخیری علیہ الرحمۃ کی تصانیف

تاریخ و سیرت

- ۔۔۔ کا لال — صہ
- ۔۔۔سیدہ کا لال — ۱۲/عہ
- ۔۔۔رہ سما — عہ
- ۔۔۔ت پنج روزہ یا وداعِ ظفر — ۸/عہ
- وداعِ خاتون — ۸/
- ۔۔۔ کا دم واپسیں — ۴/
- ۔۔۔ کی آخری بہار — صہ
- ۔۔۔ رفتگاں (با تصویر) — ۱۰/
- داستانِ پارینہ — ۱۲/
- ۔۔۔ت کی مائیں — ۱۲/

مذہبی مضامین

- احکامِ نسواں — صہ
- حُسنِ حقیقی — ۶/
- عیسائیں — ۸/
- قرآنی قصے — صہ
- نورِ اسلام — صہ

نظموں کے مجموعے

- رودادِ قفس — ۱۲/
- گرفتارِ قفس — ۴/

سیاسی صحافی سیاحی مضامین

- شہیدِ مغرب — عہ
- یادگارِ تمدن — ۶/
- عالمِ نسواں — ۸/
- سیاحتِ ہند — عہ

اصلاحی معاشرتی ناول

- حیاتِ صالحہ — مہ
- منازل السائرہ مکمل — ۸/مہ
- صبحِ زندگی — مہ
- شامِ زندگی — صہ
- شبِ زندگی دو حصے — ۸/مہ
- نوحۂ زندگی — ۱۲/
- طوفانِ حیات — صہ
- جوہرِ قدامت — ۸/مہ
- سمرنا کا چاند — ۴/مہ

اسلامی تاریخ بطرزِ ناول

- ماہِ عجم — ۸/عہ
- عروسِ کربلا — ۴/مہ
- یاسمینِ شام — ۴/
- محبوبۂ خداوند — ۱۲/
- تیغِ کمال — صہ
- شہنشاہ کا فیصلہ — ۴/
- منظرِ طرابلس — ۵/
- شاہینِ وفدراج — ۸/
- دُرِّ شہوار — ۸/
- آفتابِ دمشق — ۸/عہ
- اندلس کی شہزادی — ۸/

حضرت علامہ راشد الخیری علیہ الرحمۃ کی ان تصانیف کا اور دیگر مطبوعاتِ عصمت کی مفصل اشتہار فہرستِ کتب طلب فرما کر ملاحظہ کیجئے۔

مختصر افسانوں کے مجموعے

- جوہرِ عصمت — مہ
- سیلابِ اشک (با تصویر) — صہ
- طوفانِ اشک — صہ
- قطراتِ اشک — ۴/مہ
- خدائی راج (آخری افسانے) — عہ
- نسوانی زندگی — ۸/
- گلدستۂ عید — ۸/
- گوہرِ مقصود — ۶/
- گردابِ حیات — صہ
- بساطِ حیات — ۶/
- حور اور انسان — ۱۲/
- نشیب و فراز — ۴/

مضامین کے متفرق مجموعے

- عروسِ مشرق — ۱۰/
- گدڑی میں لعل — ۴/عہ
- مسلمان عورت کے حقوق — ۱۲/
- نالۂ زار — ۱۲/
- بلبلِ بیمار — ۱۰/
- ساجن موہنی — ۴/
- شادی کا انتخاب — ۸/
- فریبِ ہستی — ۶/
- بے فکری کا آخری دن — ۴/
- چمنستانِ مغرب — صہ
- بکھری ہوئی پتیاں — ۶/عہ

لڑکیوں کا نصاب زیرِ طبع

اصلاحی معاشرتی افسانے

- بنت الوقت — ۸/
- سرابِ مغرب — ۸/
- فسانۂ سعید — ۸/
- سودائے نقد — ۵/
- تمغۂ شیطانی — ۱۲/
- سات روحوں کے اعمالنامے — ۸/
- غدر کی ماری شہزادیاں — ۱۲/
- ستونتی — ۴/
- سنجوگ — ۱۰/
- سوکن کا جلاپا — ۵
- موودہ — ۴/
- تفسیرِ عصمت — ۵/
- انگوٹھی کا راز — ۶/
- منازلِ ترقی — ۴/
- بچہ کا کرتہ — ۴/
- ویڈیا کی سرگذشت — ۴/
- چہار عالم — ۴/

مزاحیہ افسانے

- نانی عشو — ۱۰/
- ولایتی نبھی — ۶/
- دادا لال بجھکڑ — ۸/

ادبِ لطیف و انشا

- قلبِ حزیں — ۸/
- لڑکیوں کی انشا — ۱۲/
- مسلی ہوئی پتیاں — ۶/

محصول ڈاک بذمہ خریدار — ملنے کا پتہ: عصمت بک ڈپو دہلی — محصول ڈاک بذمہ خریدار

بچیوں کے لئے ملک کا واحد رسالہ | ادیبہ جلیلہ علامہ خاتون اکرم مصنفہ کی یادگار | ... علامہ راشد الخیری علیہ الرحمۃ

رسالہ عصمت دہلی

ہندوستان بھر کے تمام زنانہ اخبارات و رسائل میں سب سے اچھا اور سب سے زیادہ مقبول و مشہور باتصویر ماہوار رسالہ چوتھائی صدی سے شائع ہو رہا ہے عصمت ہندوستان کے مشہور ادیبوں اور ملک کی بہترین لکھنے والی خواتین کے اعلیٰ درجہ کے مضامین ۸۰ صفحوں پر ہر ماہ شائع کرتا ہے عصمت ہی وہ پرچہ ہے جو صوری و معنوی خوبیوں کے لحاظ سے شریف بیگمات کے لئے ہندوستان کا چوٹی کا رسالہ تسلیم کیا جاتا ہے۔

سالانہ چندہ پانچ روپے

جوہر نسواں دہلی

ہندوستان بھر میں زنانہ دستکاری کا واحد ماہوار رسالہ جو ۱۹۳۴ء سے کامیابی کے ساتھ جاری ہے۔ جس میں کشیدہ۔ کروشیا۔ جالی تارکشی۔ ننگ۔ کارچوب۔ کینوس۔ کراس اسٹیچ۔ سلمہ ستارہ۔ بن بُنی۔ کتاؤ اور کپڑوں کی سلائی۔ کٹائی وغیرہ وغیرہ مختلف قسم کی زنانہ دستکاریوں کے عمدہ عمدہ نمونے اور مفصل ترکیبیں اور کارآمد ہدایتیں شائع ہوتی ہیں۔ جوہر نسواں کے مضامین پھوہڑ لڑکیوں کو بھی سگھڑ اور ہنرمند بنا دیتے ہیں۔ جوہر نسواں کی قلمی معاونین ہندوستان کی مشہور دستکار خواتین ہیں۔ سال میں دو خاص نمبر شائع ہوتے ہیں۔ سالانہ چندہ تین روپیہ نمونہ ۴ر

بنات دہلی

حضرت علامہ راشد الخیری علیہ الرحمۃ نے ۱۹۱۲ء میں یہ ماہوار رسالہ بچیوں کے لئے جاری فرمایا تھا عصمت کی طرح بنات بھی پابند وقت رسالہ ہے بچیوں کے لئے بہترین مضامین سبق آموز نظمیں مزیدار کہانیاں۔ دلچسپ کھیل معمے وغیرہ نہایت آسان زبان میں شائع کرتا ہے ہندوستان کے مختلف صوبوں کے محکمہائے تعلیم نے بچیوں اور بچوں کے مدرسوں کے لئے منظور کیا ہے۔

سالانہ چندہ ڈیڑھ روپیہ جو بذریعہ منی آرڈر بھیجا جائے۔ بذریعہ وی پی عہ۱۲

عصمت بک ڈپو دہلی زنانہ لٹریچر کا ہندوستان بھر میں سب سے بڑا دارالاشاعت ہے فہرست مطبوعات مفت منگائیے